داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

کی

سرِ ورق : مسجد نبوی کا ایک اندرونی حصہ جو ''ریاض الجنۃ'' کے برابر واقع ہے یہاں آنحضرت ﷺ ان لوگوں کو اسلام کی تعلیمات اور درس دیا کرتے تھے جو دنیوی لحاظ سے غریب تھے مگر ایمان کی دولت سے سرشار تھے۔ یہ لوگ اصحاب صفہ کہلاتے تھے۔ اسی مناسبت سے یہ جگہ ''مقام اصحاب صفہ'' کہلاتا ہے۔

ابوسلیم محمد عبدالحی رح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم ۝ ط

نبی عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ایک ایسا موضوع ہے جس پر بے شمار لوگوں نے لکھا ہے اور قیامت تک اس سعادت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ موضوع ہی کچھ ایسا ہے کہ چاہے اس پر جتنے لوگ لکھیں اور جتنا کچھ لکھیں کبھی مضمون کی خشکی اور عدم دلچسپی کی شکایت پیدا نہ ہو سکے گی۔ نبی پاک کی حیات طیبہ کے اتنے گوشے ہیں اور ہر گوشے کے اتنے تقاضے کہ کبھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔ یہاں تو وہی حال ہے کہ

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اُردو زبان میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ آسان بھی مشکل بھی، مختصر بھی اور طویل بھی۔ لیکن ایک عرصے سے دل میں خلش تھی کہ کوئی کتاب اس زبان میں ایسی بھی ہوتی جس میں داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی تفصیل کچھ اس انداز سے سامنے آتی کہ پڑھنے والے کے سامنے اس کارِ عظیم اور اس تحریک کا بھی ایک نقشہ آتا چلا جاتا جس کے پورا کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مامور تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کوئی آسان کام نہیں، اس کے لئے وسیع علم، عمدہ تصنیفی صلاحیت، ضروری کتب کی خاطر خواہ فراہمی اور کافی فرصت کی ضرورت ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اس خدمت کی سعادت اپنے کس بندے کو عطا فرمائے۔

اتفاق کہ ۱۲/اگست ۵۴ء سے ۱۱/اگست ۵۵ء تک ڈسٹرکٹ جیل رائے بریلی میں اور اسباب تو نہیں البتہ فرصت کافی میسر آئی اس وقت یہ خیال سامنے آیا کہ اس نظر بندی کی مدت کو کیسے زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جائے۔ چنانچہ اللہ کے فضل وکرم نے رہنمائی فرمائی اور طبیعت اِس راہ پر یکسو ہوگئی کہ اس فرصت کو اُس خواہش کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔

جیل میں کتابوں کی ایک محدود تعداد ہی مہیا ہوسکتی تھی۔ چنانچہ سیرت النبی، تفہیم القرآن اور چند دوسری چھوٹی چھوٹی کتابوں کے علاوہ وہاں اور کچھ فراہم نہ ہوسکا اور اللہ کا نام لے کر ان ہی کتابوں کی بنیاد پر آسان زبان میں اپنی استعداد کی حد تک اس خواہش کی تکمیل کر لی جو عرصے سے دل میں اُبھرا کرتی تھی۔

موضوع کا حق کہاں تک ادا ہوسکا۔ اس کا اندازہ مطالعہ کرنے والوں کو تو کتاب کے مطالعہ سے ہو ہی جائے گا۔ البتہ لکھنے والے کو پورا پورا احساس ہے کہ اس موضوع کا حق ادا کرنے کی نہ اس میں اہلیت تھی اور نہ اس کے لئے اسباب ہی فراہم تھے، اس کے باوجود کچھ اُمیدیں تھیں جن کی بنیاد پر اس کام کے کرنے کی ہمت ہوئی اور اُسے کرلیا گیا۔

(۱) ہوسکتا ہے کہ یہ ادنیٰ کوشش دوسرے باصلاحیت لوگوں کے لئے ایک محرک بن جائے اور وہ اس کام کو کماحقہ کردیں۔

(۲) آسان اُردو میں سیرت پاک پر ایک نئے انداز سے لکھی ہوئی ایک کتاب کا اضافہ ہوجائے۔

(۳) یہ اُمید کہ اللہ تعالیٰ اِس کوشش کو قبول فرمالے اور اس کے ذریعے کچھ لوگوں کی تحریک اسلامی کے مزاج اور اس کے طریقہ کار کی طرف رہنمائی ہو جائے اور اس طرح کچھ نئی روحوں میں اسلامی نصب العین کی طرف بڑھنے کا ولولہ اُبھرے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم

ابوسلیم محمد عبدالحی

ڈسٹرکٹ جیل رائے بریلی
دوشنبہ ۲۰/ذی قعدہ ۱۳۷۴ھ
۱۱/جولائی ۱۹۵۵ء

فہرست عنوانات

چھٹا باب

بارھواں باب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن. وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍوَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنُ

پہلا باب

اسلامی تحریک اور اس سے پہلے

اسلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دنیا کی ایک عظیم الشان اصلاحی تحریک ہے۔ وہی تحریک جسے ہر زمانے اور ہر ملک میں اللہ کے بھیجے ہوئے نبی لاتے رہے ہیں۔ اس تحریک نے نہ صرف روحانی بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی ایسی اصلاح کی ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر تحریک ہے جو بہ یک وقت روحانی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی سب کچھ ہے اور جس کے دائرے سے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہیں۔

تحریک اسلامی کی اہمیت:-

دنیا میں اصلاحی اور انقلابی تحریکیں بہت سی اٹھتی رہی ہیں لیکن اسلامی تحریک اپنی وسعت اور کچھ دوسری خصوصیات کے اعتبار سے ان سب سے ممتاز ہے۔ اس تحریک کا اُٹھان کس طرح ہوا؟ اس کو پیش کرنے والے نے کس طرح پیش کیا اور اس کا کیا ردعمل ہوا۔ یہ سوالات ہر اس ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جس کو ابتداً اس تحریک کا کچھ نہ کچھ تعارف ہوتا ہے۔ لیکن ان سوالات کے جوابات معلوم کر لینا محض تاریخ دانی کے ذوق کی تکمیل ہی نہیں ہے بلکہ ان جوابات کی اصل اہمیت یہ ہے کہ ان کو معلوم کرنے کے نتیجے میں ایک ایسی مکمل اصلاحی

تحریک ہمارے سامنے آتی ہے جو آج بھی ان تمام مسائل کے حل کرنے کے لئے ضروری اور کافی ہے جن میں انسان الجھا ہوا ہے۔ یہ تحریک ایک طرف تو انسان کو اس کے واقعی نفع اور نقصان کا صحیح مطلب بتاتی ہے، اس کے سامنے اس ابدی زندگی کی حقیقتیں واضح کرتی ہے جو ہر انسان کی آخری منزل ہے اور پھر دنیا کی زندگی کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل تجویز کرتی ہے جو اس ابدی زندگی کو کامیاب بنانے کے ساتھ ساتھ اس زندگی کو بھی اس طرح سنوار دیتی ہے کہ پھر انسان کو ان تمام الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے جن کے حل کرنے میں وہ ہمیشہ پریشان رہا ہے اور آج بھی ہے۔

اسلامی تحریک کی یہی ایک خصوصیت ہے جو ہر طالب علم کو متوجہ کرتی ہے کہ وہ اسے قریب سے دیکھے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ اس تحریک کے بارے میں جو یہ اتنا بڑا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہ کہاں تک درست ہے۔

اسلامی تحریک کو سمجھنے کے لئے یوں تو بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی اور ان کی مدد سے اسلامی تحریک کا نہایت واضح تعارف بھی ہو جاتا ہے لیکن جس طرح روشنی کے تصور کو چراغ سے اور خوشبو کے احساس کو پھول سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح کسی ایسی عظیم الشان تحریک کو بھی اُس کے محرک کے تصور سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے جب لوگوں کے سامنے اسلامی تحریک کا ذکر آتا ہے تو وہ معاً تحریک کے داعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات اور تحریک کی دعوت کے اصل ماخذ یعنی قرآن پاک کی تشریح اور تفسیر کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ مطالبہ بالکل فطری ہے۔

تحریک اسلامی کا ایک امتیاز:-

سب جانتے ہیں کہ انسانیت کا سب سے مقدم فرض اور اس کی سب سے بہتر خدمت یہی ہے کہ لوگوں کی اخلاقی تربیت کی جائے۔ ان کی برائیوں کو دور کیا جائے۔ اور ان کے سامنے زندگی کا ایک ایسا مکمل نقشہ پیش کیا جائے جس پر چل کر انسان صحیح معنوں میں کامیاب ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے طریقوں پر کام کیے ہیں لیکن اس قسم کے اصلاحی کام کرنے والوں نے انسانی اصلاح کے کچھ گوشوں کو اپنے لیے مخصوص کرلیا اور پھر ان ہی گوشوں میں جو کچھ کر سکتے تھے وہ کیا۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو اپنا مرکز بنایا۔ کسی نے تہذیب وتمدن کو سنوارنے کی کوشش کی، کسی نے حکومت اور سیاست کو اپنا میدان بنایا لیکن ایسے مصلحین جنھوں نے انسان کی پوری زندگی کو سنوارنے کا فیصلہ کیا حضرات انبیائے کرام علیہم السلام ہی ہیں۔

اس کائنات کے پیدا کرنے والے کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام میں جو نبی سب سے آخر میں تشریف لائے ان کی دعوت اور ان کی زندگی کے حالات آج تک اس طرح محفوظ ہیں کہ اس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات اس طرح قلم بند ہوئے کہ ایک طرف تو صحت کا ایسا انتظام ہوا جو آج تک کسی تاریخی ریکارڈ کو میسر ہی نہ ہو سکا۔ اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کا یہ حال کہ آپ کی باتیں، کام، زندگی گزارنے کا ڈھنگ، شکل وصورت، اٹھنا بیٹھنا، بول چال، رہن سہن، معاملات، انتہا یہ کہ کھانے پینے، سونے جاگنے اور

ہنسنے بولنے تک کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی۔ غرض یہ کہ آج جو تفصیلات ہم اپنے زمانے سے چند سو برس پہلے گذرے ہوئے بڑے لوگوں کے بارے میں نہیں جانتے وہ تقریباً ڈیڑھ ہزار برس گذرنے کے بعد بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جان سکتے ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے سے پہلے ایک اور خصوصیت پر نظر رکھنا چاہیے۔ ہر کام کی اہمیت کا اندازہ ان حالات سے ہوتا ہے جن میں وہ کام انجام دیا گیا ہو سازگار اور موافق حالات میں جو تحریکیں دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہیں وہی ناسازگار حالات میں بالکل مرجھا کر رہ جاتی ہیں۔ عام طور پر تحریکوں کا حال یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں اس کی قبولیت کے لئے مواد پکتا رہتا ہے اور پھر جب یکبارگی کسی طرف سے کوئی تحریک اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو جاتی ہیں اور تحریک چل نکلتی ہے مثلاً کسی آزادئ وطن کی تحریک کو لے لیجیے۔ لوگ عام طور پر کسی بیرونی حکمران طاقت کے ظلم اور زیادتیوں سے نالاں ہوتے ہیں اور دلوں میں اس کے خلاف ایک جذبہ پیدا ہوتا رہتا ہے پھر جب کوئی باہمت شخص اُٹھ کر وطن کی آزادی کا نعرہ بلند کر دیتا ہے تو چاہے خطروں اور نقصانات کے اندیشوں کی وجہ سے تھوڑے ہی لوگ اس کا ساتھ دیں لیکن اکثریت کی دلی ہمدردیاں اسی کے ساتھ ہوتی ہیں یہی حال معاشی تحریکوں کا ہے لوگ اپنی مجبوریوں اور معاشی لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی زیادتیوں کی وجہ سے خود عاجز ہو جاتے ہیں اور ایسے موقع پر اگر کوئی تحریک معاشی اصلاح وانقلاب کی اُٹھتی ہے تو پھر یہ سب

لوگ اسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن ذرا تصور کیجیے ایک ایسی تحریک کا جو بالکل
مخالف حالات میں اُٹھے مثلاً کسی آزاد ملک میں کوئی شخص یہ نعرہ بلند کرے کہ
ملک کو فلاں طاقت کی غلامی اختیار کر لینی چاہیے جب کہ ملک کے سارے ہی
باشندے آزادی کو عزیز رکھتے ہوں تو تصور کیجیے ان مصائب اور مشکلات کا جو
ایسے حالات میں ایسی بات پیش کرنے والے کو پیش آسکتے ہیں۔

تحریک اسلامی کے داعی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اصلی اہمیت اور آپ کے
کام کی واقعی عظمت کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا جب تک آپ کے سامنے یہ بات نہ
ہو کہ آپ نے جو کچھ پیش کیا وہ کیسے مخالف حالات میں پیش کیا اس لئے آپ
کے واقعات زندگی کے مطالعہ سے پہلے یہ بھی دیکھ لیجیے کہ جب اسلام کے داعیؐ
نے اسلام پیش کیا اس وقت ملک عرب اور ساری دنیا کے حالات کیا تھے؟

اسلام کی دعوت کے وقت دنیا کے حالات:-

اسلام نے جو کچھ پیش کیا اس کی اصل بنیاد توحید ہے۔لیکن یہی وہ روشنی ہے
جس سے اس وقت نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیا محروم تھی۔توحید کے صحیح تصور
سے انسانی ذہن خالی تھے یہ صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے صحیح
اسلام کے داعی بے شمار آچکے تھے اور زمین کا ہر آباد علاقہ توحید خالص کے پیام
سے سرفراز ہو چکا تھا لیکن انسانیت کی بدنصیبی کہ اس نے اس سبق کو بھلا دیا تھا اور
اپنی خواہشات کے مطابق چاند، سورج، ستاروں، جنوں، فرشتوں، دیوی،
دیوتاؤں، پہاڑوں، دریاؤں، جانوروں، انسانوں اور نہ جانے کن کن کو
الوہیت میں شریک کرلیا تھا اور اب انسان ایک کی بندگی میں سکون پانے کے

بجائے بے شمار معبودوں کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔

اس وقت سیاسی اعتبار سے دو اہم طاقتیں موجود تھیں فارس اور روم۔ فارس کا مذہب مجوسیت تھا جو عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا روم کا مذہب عیسائیت تھا جو یورپ ایشیا اور افریقہ کو گھیرے ہوئے تھا لیکن ان کے علاوہ مذہبی اعتبار سے یہودی اور ہندو بھی اہمیت رکھتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ صداقت کا دعویٰ تھا۔

ایران میں ستاروں کی پوجا عام تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ اور امراء بھی درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے جن کو سجدے کیے جاتے تھے۔ ان کی خدائی کے گیت گائے جاتے تھے۔ غرض یہ کہ پورا ملک توحید کے تصور سے خالی تھا۔

روم کی حکومت:۔

یونان کے زوال کے بعد روم کی حکومت دنیا کی سب سے بڑی حکومت سمجھی جاتی تھی لیکن چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یہی حکومت اپنی پستی کے آخری نقطہ تک پہنچ چکی تھی۔ حکومت کی بدنظمی، دشمن کا خوف، ملک کے اندر بدامنی، اخلاق کی انتہائی گراوٹ، عیش پرستی کی انتہا، غرض یہ کہ کوئی برائی ایسی نہ تھی جو ان میں پیدا نہ ہوگئی ہو۔ مذہبی اعتبار سے کچھ لوگ تو ستاروں اور دیوتاؤں کے بتوں کی پرستش میں مصروف تھے لیکن جن لوگوں نے عیسائی مذہب قبول بھی کرلیا تھا وہ بھی توحید کے تصور سے خالی ہوگئے تھے۔ وہ باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے۔ سینکڑوں مذہبی فرقے بن گئے تھے اور یہ سب آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ قبر پرستی عام تھی۔ پادریوں کو سجدے کیے جاتے تھے،

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدے داروں نے اپنی اپنی جگہ شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ حرام وحلال کے اختیارات ان کو حاصل تھے اور ان کا قول خدا کا قول سمجھا جاتا تھا۔ دینداری کا اونچا تصور رہبانیت اور دنیا کو چھوڑ دینا تھا۔ ہر قسم کے آرام وآسائش سے جسم کو محروم رکھنا سب سے بڑی عبادت سمجھا جاتا تھا۔

ہندوستان :-

ہندوستان میں اس وقت وہ دور تھا جس کو مذہبی ادوار میں پورانک دور کہا جاتا ہے یہ دور ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک دور مانا جاتا ہے۔ اس وقت برہمنیت پھر سے غالب آرہی تھی اور بودھوں کا تقریباً قلع قمع ہو چکا تھا۔ اس دور کی خصوصیات یہ ہیں کہ شرک حد سے بڑھ چکا تھا۔ دیوتاؤں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ویدوں کے زمانے میں بت پرستی کا رواج نہ تھا لیکن اس وقت مندروں میں بتوں کی پوجا عام تھی۔ مندروں کے پجاری بداخلاقی کا نمونہ تھے اور کم سمجھ عوام کو لوٹنا ان کا کام تھا۔ اسی زمانے میں ذات پات کی تفریق بھی انتہا پر تھی حالانکہ ابتدائی زمانے میں اس قسم کی تفریق موجود نہ تھی اس تفریق نے سماج کے سارے نظام کو برباد کر دیا تھا ایسے قوانین بنا لئے گئے تھے جن میں انصاف کا خون ہوتا تھا اور نسل اور خاندان کے اعتبار سے لوگوں کو غلط رعائتیں دی جاتی تھیں۔ شراب پینے کا عام رواج تھا۔ خدا کی تلاش میں بنوں اور پہاڑوں میں عمریں گذارنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اوہام اور فاسد خیالات اپنی انتہا پر تھے بھوت پریت اور سیکڑوں

قسم کے شگونوں نے انسانی زندگی کو جکڑ رکھا تھا۔ ہر عجیب چیز خدا تھی، ہر ایک کے سامنے سر جھکا دینا ہی گویا مذہب بن گیا تھا۔ دیوی، دیوتاؤں اور بتوں کی گنتی اندازہ اور قیاس سے باہر تھی۔ پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی، خلاقی حیثیت انتہائی شرمناک ہو چکی تھی اور ستم یہ تھا کہ یہ سب کچھ مذہب کے نام پر کیا جاتا تھا۔ عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ بیوہ عورت عمر بھر کے لئے قانونی طور پر ہر لذت سے محروم کر دی جاتی تھی۔ سماج کے ایسے ہی شرمناک برتاؤ کی وجہ سے ایک عورت شوہر کے بعد زندہ جل جانا گوارہ کر لیتی تھی۔ لڑائی میں ہار جانے کے ڈر سے عورتوں کو خود ان کے باپ، بھائی اور شوہر اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ ننگے مردوں اور عورتوں کی پوجا ہوتی تھی، مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر بدمست ہو جاتے تھے اور یہ سب دھندے نیکی کا کام سمجھے جاتے تھے۔ غرض یہ کہ اخلاق، مذہب اور معاشرت کے اعتبار سے اللہ کی یہ زمین بری طرح شیطان کے جال میں جکڑی ہوئی تھی۔

یہود:-

خدا کے دین کے حامل ہونے کے اعتبار سے اصلاح کی کوئی توقع اگر کی جا سکتی تھی تو وہ یہود سے کی جا سکتی تھی لیکن ان کی حالت بھی انتہائی پست ہو چکی تھی۔ اُنھوں نے اپنی لمبی تاریخ میں ایسے ایسے جرائم کیے تھے جن کی وجہ سے اب ان کا یہ مقام ہی نہ رہ گیا تھا کہ وہ کوئی اصلاحی کام کر سکیں۔ انتہا یہ کہ جب کبھی ان کے اندر اللہ کا کوئی نبی آتا تو وہ اس کی باتوں کو برداشت تک نہ کر سکتے تھے اور

نہ جانے اُنھوں نے کتنے نبیوں کو قتل کیا۔ یہ اس گمان میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کا خدا سے کوئی خاص تعلق ہے اور اس کی بنیاد پر وہ انھیں عذاب ہی نہ دے گا۔ ان کا خیال تھا کہ جنت کی نعمتیں اصل میں ان کیلئے ہی بنائی گئی ہیں۔ نبوت اور رسالت کو وہ اپنی قومی میراث کہتے تھے۔ ان کے عالم انتہائی دنیادار اور زمانہ ساز تھے۔ وہ دولت مندوں اور حاکموں کی خوشنودی کیلئے آئے دن مذہبی احکام میں کاٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔ اللہ کے احکام میں جو حکم آسان اور اپنی خواہش کے مطابق ہوتا اس پر عمل کر لیتے اور جو احکام سخت اور ناپسند ہوتے ان کو چھوڑ دیتے آپس میں لڑنا مرنا ان کا عام مشغلہ ہو گیا تھا۔ مال و دولت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس کی وجہ سے وہ کوئی ایسا کام کرنے کا ارادہ تک نہ کر سکتے تھے جس میں جان و مال کا کوئی اندیشہ ہو۔ اسی وجہ سے وہ ان کی اخلاقی حالت انتہائی کمزور ہو گئی تھی۔ ان میں مشرکانہ بت پرستی کے اثرات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ ٹونے ٹوٹکے، اوہام، خرافات، گنڈے، تعویذ، جادو، عملیات وغیرہ وغیرہ قسم کی سیکڑوں چیزوں نے ان کے اندر گھس کر توحید کے اصل تصور کو بالکل برباد کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب اللہ کے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے توحید کا واضح تصور پیش کیا تو ان ہی یہودیوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ان مسلمانوں سے تو عرب کے مشرک بہتر ہیں۔

عرب کی حالت:-

دنیا کے مذہبی اور سیاسی حالات پر نظر ڈالنے کے بعد آیئے خود عرب کی حالت پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ کے نبی نے اپنی تحریک کا آغاز کیا اور جہاں کے حالات سے اُنھیں سب سے پہلے دوچار ہونا پڑا۔

عرب کے ایک بڑے حصے یعنی وادی قریٰ اور خیبر وفدک میں زیادہ تر یہودی آباد تھے خود مدینے میں بھی یہودیوں کی حکومت تھی باقی ملک میں مشرکانہ رسوم جاری تھیں لوگ بتوں، پتھروں، پیڑوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پوجا کرتے تھے البتہ ایک اللہ کا تصور ضرور موجود تھا۔ اُسے یہ لوگ خداؤں کا خدایا سب سے بڑا خدا مانتے تھے لیکن یہ اعتقاد اتنا کمزور پڑ گیا تھا کہ عملاً وہ اپنے ان ہی چھوٹے چھوٹے خداؤں اور معبودوں میں الجھے رہتے تھے جن کو انھوں نے اللہ کے علاوہ اپنا خدا بنالیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ روزمرہ کی زندگی میں اصل کام تو ان چھوٹے خداؤں سے پڑتا ہے لہٰذا یہ ان ہی کی عبادت کرتے تھے ان ہی کے ناموں پر نذریں اور قربانیاں کرتے تھے۔ اور ان سے ہی اپنی مرادیں مانگتے تھے۔ اللہ کے بارے میں ان کا یہ اعتقاد تھا کہ چھوٹے خداؤں کو خوش کر لینے سے اللہ بھی خوش ہو جاتا ہے۔

یہ لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، جنوں کو خدا کا عزیز قریب اور خدائی میں شریک سمجھتے تھے اور اسی نسبت سے ان کی پرستش کرتے تھے اور ان سے مدد مانگتے تھے جن ہستیوں کو یہ خدائی میں شریک مانتے تھے ان کے بت بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے بت پرستی کا شوق اتنا عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوب صورت سا پتھر پڑا مل گیا اس کو پوجنے لگے اور کچھ نہ ملا تو مٹی کا ایک گوندا بنایا، اس پر بکری کا دودھ چھڑکا اور اسی کا طواف کرنا شروع کر دیا۔ غرض یہ کہ عربوں کے بے شمار بت تھے۔ ان بتوں کے علاوہ عرب ستاروں کو بھی پوجتے تھے، مختلف قبیلے مختلف ستاروں کو پوجتے تھے ان میں سورج اور چاند کو زیادہ اہمیت

تھی جنوں اور بھوت پریت کی بھی پوجا ہوتی تھی ان کے بارے میں ان میں عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کے توہمات جو مشرکانہ قوموں میں عام ہوتے ہیں وہ بھی سب ان میں پائے جاتے تھے۔

اس مذہبی بگاڑ کے ساتھ ساتھ آپس کی لڑائی ان کے یہاں عام بات تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر جنگ ٹھن جاتی اور پھر اس کا سلسلہ پشتوں تک چلتا رہتا، جوا کھیلنا اور شراب پینا اتنا عام تھا کہ شاید ہی کوئی قوم اس معاملے میں ان کا مقابلہ کرسکتی، شراب کی تعریف اور اس کے تعلق سے ہونے والی بدکاریوں کے ذکر سے ان کی شاعری بھری پڑی تھی۔ اس کے علاوہ سودخوری، لوٹ مار، چوری، بے رحمی اور کشت وخون زنا اور دوسرے گندے کاموں نے ان کو گویا انسانی شکل میں درندہ بنا دیا تھا، وہ اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کردیا کرتے تھے۔ بے شرمی اور بے حیائی کا یہ عالم تھا کہ مرد اور عورتیں ننگے ہوکر خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اُسے ایک مذہبی کام سمجھتے تھے غرض یہ کہ مذہب، اخلاق، معاشرت اور سیاست ہر اعتبار سے عرب انتہائی پستی میں گر چکے تھے۔

تحریک اسلامی کے لئے عرب کی خصوصیات:-

نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا جس اندھیرے میں بھٹک رہی تھی اس کے لئے ایک ایسی صبح کی ضرورت تھی جو ساری اندھیریوں کو دور کردے اور اللہ کے بھٹکے ہوئے بندوں کو اللہ کی راہ دکھادے اور اس صبح کے طلوع ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا میں عرب کے ملک کو ہی کیوں پسند فرمایا اس بارے میں بھی چند باتیں قابل غور ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کے لئے ہدایت اور رہنمائی کا آخری پیام دے کر بھیجنے کے لئے منتخب فرمایا تھا اور آپ کی دعوت کو ساری دنیا میں پھیلنا تھا ظاہر ہے کہ کسی ایک فرد کی زندگی اس عظیم کام کے لئے کافی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اللہ کے نبی اپنی موجودگی میں مصلحین کا ایک ایسا گروہ تیار کر جائیں جو آپ کے بعد بھی آپ کے کام کو جاری رکھے۔ اس اہم کام کے لئے جس قسم کی خصوصیات کی ضرورت تھی وہ عرب کے باشندوں میں زیادہ اونچے پیمانہ پر اور عمومیت کے ساتھ پائی جاتی تھیں۔ نیز ملک عرب کا جغرافیائی مقام بھی کچھ ایسا ہے کہ وہ آباد دنیا کے تقریباً مرکز میں واقع ہے اور اس طرح اس پیام کو چاروں طرف پھیلانے میں بہت کچھ آسانیاں تھیں۔

اس کے علاوہ عربی زبان کی وسعت اور خصوصیات ایسی ہیں کہ جس مضمون کو پیش کرنا تھا اس کو جس قدر آسانی کے ساتھ عربی زبان میں ادا کیا جاسکتا تھا دنیا کی دوسری زبانوں کے دامن اس کے لئے بہت تنگ تھے۔

عربوں کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ محکوم نہیں تھے غلامی کی وجہ سے ذہنوں میں جو پستی آجاتی ہے اور اعلیٰ انسانی صفات میں جو گراوٹ پیدا ہو جاتی ہے اس سے یہ لوگ محفوظ تھے۔ ان کے چاروں طرف ایران اور روم کی بڑی بڑی حکومتیں تھیں لیکن ان میں سے کوئی عربوں کو اپنا غلام نہ بنا سکی تھی۔ وہ حد سے زیادہ بہادر اور شجاع تھے۔ خطروں کو کبھی دھیان میں نہ لاتے تھے، لڑائی کو کھیل سمجھتے تھے، پرجوش تھے، ارادے کے پختہ تھے دل کے صاف تھے جو بات دل

میں ہوتی وہی زبان پر ہوتی۔ چھل کپٹ اور لاگ لگاؤ کی بیماریاں جو عام طور پر غلام اور بزدل قوموں میں پیدا ہوجاتی ہیں اُن سے وہ پاک تھے، عام سمجھ اور عقل کے اعتبار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ ذہنی طور پر بلند تھے، باریک باتوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ حافظہ بہت تیز تھا۔ اتنا تیز کہ اس بارے میں یہ لوگ دنیا میں اپنی ہم عصر قوموں میں یکتا تھے۔ فیاض تھے۔ خوددار اور غیرت مند تھے ذلیل ہونا برداشت نہ کرسکتے تھے۔ ریگستان کی سخت زندگی کے باعث عملی قسم کے لوگ تھے کسی بات کو قبول کرلینے کے بعد ان کے لئے یہ بہت دشوار تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے اس کی داد دیا کریں بلکہ اس کے برخلاف وہ اس بات کو لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور دیکھتے دیکھتے اپنی پوری زندگی کو اپنے پسندیدہ کام میں لگادیتے تھے۔

عربوں کی اصلاح میں مشکلات:-

ایک طرف تو عرب کی سرزمین عرب کی زبان اور عرب کے باشندوں کی یہ خصوصیات تھیں جن کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیام کو اس ملک اور ان لوگوں پر بھیجنا طے فرمایا لیکن دوسری طرف وہ مشکلات بھی کچھ کم نہ تھیں جو اس قوم کی اصلاح کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برداشت کرنا پڑیں۔ ابتدا ہی میں لکھا جاچکا ہے کہ ہر کام کی عظمت کو جانچنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کن حالات میں کیا گیا۔ چنانچہ اسلامی تحریک جس زمانے میں اُٹھی اور کامیاب ہوئی اس اعتبار سے وہ دنیا کی تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور اس اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قوم کو دنیا کی امامت کے لئے تیار

کیا اور اس سلسلے میں گونا گوں مشکلات کو جس طرح سر کیا وہ بھی ایک معجزے سے کم نہیں۔

جب تک عرب قوم کی یہ خصوصیات سامنے نہ ہوں کوئی شخص اس عظیم اصلاحی کام کا اندازہ نہیں کرسکتا جو اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس قوم کی اصلاح میں چند در چند مشکلات حائل تھیں۔ ان میں سے بڑی بڑی اور قابل ذکر یہ ہیں۔

عرب قوم بالکل ان پڑھ تھی۔ خدا کی ذات وصفات کا صحیح تصور رسالت کی نوعیت اور اہمیت، وحی کا مفہوم، اللہ کی کتاب کا فہم، آخرت کا تصور، عبادت کا صحیح مطلب غرض یہ کہ ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے وہ پہلے سے واقف ہوں پھر یہ لوگ اپنے باپ دادا کے رسم ورواج کے ایسے اندھے پیرو تھے کہ ان سے انچ بھر ہٹنا ان کو سخت نا گوار تھا جب کہ اسلام جو کچھ پیش کرتا تھا وہ ان کے اس آبائی مذہب کے بالکل خلاف تھا۔ شرک سے پیدا ہونے والی تمام ذہنی بیماریاں ان میں موجود تھیں۔ تو ہم پرستی نے ان کی عقل کو بیکار کر رکھا تھا۔ آپس کی لڑائیاں گویا کہ قومی خصوصیت بن گئی تھیں اور ان کی وجہ سے ان کے لئے کسی مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا آسان نہ تھا۔ وہ جو کچھ سوچتے لڑائی اور خانہ جنگی کے انداز پر سوچتے تھے۔ عام طور پر لوٹ مار ذریعہ معاش تھا۔ اس طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے تو ان کے سامنے ایک ایسی بات آتی تھی جس کو اس سے پہلے نہ اُنھوں نے سنا تھا اور نہ سمجھا تھا اور جو باپ دادا کے چلن اور ان خیالات کے بالکل خلاف تھی جن کو

وہ اب تک سینے سے لگائے ہوئے تھے۔اس دعوت کا مطالبہ تھا کہ لڑائیاں بند کرو، امن کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرو، لوٹ مار کرنا غلط ہے۔ فاسد خیالات، بری عادات اور سب سے زیادہ یہ کہ حرام ذریعہ معاش فوراً چھوڑ دو۔ظاہر ہے کہ ایک ایسی پکار پر ساتھ دینے کے لئے ان لوگوں کو تیار کرنا انتہائی مشکل کام تھا۔

غرض یہ کہ پوری دنیا کے حالات،عرب کے حالات اور جس قوم سے واسطہ تھا اس کی عادات وخصوصیات کوئی چیز بھی ایسی نظر نہیں آتی جو بظاہر اس دعوت کیلئے سازگار کہی جاسکتی ہو لیکن جب نتائج سامنے آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ:۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی اک آواز میں سوتی بستی جگادی

پڑا ہر طرف غُل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت وجبل نامِ حق سے

اور یہی وہ معجزہ ہے جس کے سامنے آتے ہی ہر انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ اس ذات گرامی کے بارے میں تفصیل سے جانے اور آپ کی پیش کی ہوئی دعوت کو قریب سے سمجھے۔آئندہ ابواب میں یہی چیز آپ کے سامنے آئے گی۔

++

دوسرا باب

پیدائش اور بچپن

خاندان:-

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار کا نام عبداللہ تھا جو عبدالمطلب کے بیٹے تھے، آپ کا سلسلہ نسب تقریباً ساٹھ پشتوں کے واسطے سے حضرت اسمٰعیل بن حضرت ابراہیم علیہما السلام سے جا کر مل جاتا ہے۔ آپ کے خاندان کا نام قریش تھا جو عرب کے تمام خاندانوں میں کتنی ہی پشتوں سے معزز اور ممتاز مانا جاتا تھا۔ عربوں کی تاریخ میں اس خاندان کے کتنے ہی لوگ بہت عزت والے اور بڑے مانے گئے ہیں مثلاً نضر، فہر، قصی بن کلاب۔ قصی اپنے زمانے میں حرم کعبہ کے متولی بنائے گئے اور اس طرح اُن کی عظمت اور بھی بڑھ گئی۔ قصی نے بہت بڑے بڑے کام کیے۔ مثلاً حاجیوں کو پانی پلانے اور ان کی میزبانی کا انتظام وغیرہ۔ یہ کام اُن کے بعد اُن کے خاندان والے کرتے رہے۔ ان خدمتی کاموں کے کرنے اور حرم کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش کو تمام عرب میں بڑی عزت اور اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ عام طور پر عرب میں لوٹ مار کا رواج تھا اور راستے محفوظ نہ تھے لیکن حرم کعبہ سے نسبت اور حاجیوں کی خدمت کی بناء پر قریش کے قافلوں کو کوئی نہیں لوٹتا تھا اور وہ امن کے ساتھ اپنا مالِ تجارت ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹے تھے۔لیکن کفر یا اسلام کی خصوصیت کی وجہ سے اُن میں سے پانچ بہت مشہور ہیں۔ایک جناب عبداللہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار تھے۔دوسرے ابوطالب۔جو اگرچہ اسلام نہیں لائے لیکن اُنھوں نے ایک عرصہ تک آپ کی سرپرستی کی۔تیسرے حضرت حمزہ اور چوتھے حضرت عباس رضی اللہ عنہما۔آپؐ کے یہ دونوں چچا مشرف بہ اسلام ہوئے اور اسلامی تاریخ میں بڑا اونچا مقام حاصل کیا اور پانچویں ابولہب۔ابولہب کی شخصیت تاریخ اسلام میں اسلام دشمنی کے لئے بہت نمایاں ہے۔

عبداللہ کی شادی قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبدمناف کی لڑکی سے ہوئی جن کا نام آمنہ تھا۔قریش کے خاندان میں آپ بڑی ممتاز بی بی تھیں۔شادی کے وقت عبداللہ کی عمر تقریباً سترہ سال تھی۔شادی کے بعد خاندانی دستور کے موافق آپ تین دن تک اپنی سسرال میں رہے۔اس کے بعد تجارت کے سلسلے میں شام چلے گئے واپسی پر مدینہ میں بیمار ہو گئے اور یہیں انتقال فرما گئے۔اس وقت حضرت آمنہ حاملہ تھیں۔

پیدائش:-

۹ ربیع الاول دوشنبہ کا دن مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کی وہ مبارک صبح تھی۔جب رحمت الٰہی کے فیصلے کے مطابق اس باسعادت ہستی کی پیدائش ہوئی جس کے وجود سے سارے عالم کی اندھیاریوں کو دور ہونا تھا اور انسانیت کو وہ نورِ ہدایت ملنا تھا۔جو قیامت تک اس زمین پر بسنے والے سارے انسانوں کے حق میں مالکِ کائنات کی سب سے بڑی نعمت ہے۔والد کا تو انتقال ہی ہو چکا تھا۔دادا عبدالمطلب نے آپ کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھا۔

پرورش اور بچپن:-

سب سے پہلے آپ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ نے دودھ پلایا اس کے بعد ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے بھی دودھ پلایا۔ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ شہر کے بڑے لوگ اپنے بچوں کو دودھ پلوانے اور بڑھنے پلنے کے لئے دیہات اور قصبات میں بھیج دیتے تھے تاکہ وہاں کی کھلی ہوا میں رہ کر اُن کی صحت اچھی ہوجائے اور وہ بہت فصیح عربی زبان بھی سیکھ جائیں۔ عرب میں شہروں کی بہ نسبت دیہات اور قصبات کی زبان بہت زیادہ فصیح اور اچھی مانی جاتی تھی۔ اس دستور کے موافق دیہات کی عورتیں شہر میں آیا کرتی تھیں اور بچوں کو پرورش کے لئے اپنے ساتھ لے جاتی تھیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے کچھ روز بعد ہی قبیلہ ہوازن کی کچھ عورتیں بچوں کی تلاش میں مکے آئیں۔ اُن میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں۔ یہی وہ خوش نصیب خاتون ہیں جن کو جب کوئی دوسرا بچہ نہ ملا تو اُنھوں نے مجبوراً آمنہ کے یتیم بچے کو ہی لے لینا منظور کرلیا۔

دو برس کے بعد حلیمہ سعدیہ آپ کو واپس لائیں۔ لیکن اس زمانے میں مکے میں کوئی بیماری پھیلی ہوئی تھی چنانچہ آپ کی والدہ نے آپ کو پھر دیہات بھیج دیا جہاں آپ تقریباً چھ سال کی عمر تک رہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھ سال کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں۔ غالباً آپ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لئے گئی ہوں، یا وہاں کوئی رشتہ داری کا تعلق ایسا ہو جس کی وجہ سے آپ نے یہ سفر اختیار فرمایا ہو آپ نے وہاں تقریباً ایک مہینے تک قیام کیا۔ واپسی میں ایک مقام ابواء پر آپ کا انتقال ہوگیا اور یہیں آپ کو دفن کیا گیا۔

والدہ کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش اور ساری دیکھ بھال عبدالمطلب کے ذمے آ گئی۔ یہ آپ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جب آنحضرتؐ کی عمر آٹھ سال کی ہوئی تو دادا عبدالمطلب نے بھی انتقال فرمایا۔ مرتے وقت اُنھوں نے آپ کی پرورش کی ذمہ داری اپنے لڑکے ابو طالب کے سپرد کی جنھوں نے اس فرض کو انتہائی خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ابو طالب اور آنحضرتؐ کے والد عبداللہ ایک ہی ماں سے تھے۔ اس اعتبار سے بھی ابو طالب کو آپ سے انتہائی محبت تھی۔ وہ آپ کے مقابلے میں اپنے بچوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے سوتے تو آپ کو ساتھ لے کر سوتے، باہر جاتے تو ساتھ لے جاتے۔

آپ کی عمر دس۔ بارہ سال کی ہوگی اُس وقت آپ نے اپنے ہم عمروں کے ساتھ بکریاں بھی چرائیں۔ عرب میں یہ کام برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اچھے اچھے شریف گھرانوں کے بچے بکریاں چَرایا کرتے تھے۔

ابو طالب تجارت کرتے تھے۔ قریش کے دستور کے موافق سال میں ایک بار شام جایا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کوئی بارہ سال ہوگی کہ ابو طالب نے شام کے سفر کا ارادہ کیا۔ اگرچہ سفر کی تکلیف کے خیال سے وہ آپ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے مگر اُنھیں آپ سے اتنی محبت تھی کہ جب سفر پر جاتے وقت آپ اُن سے لپٹ گئے اور ساتھ چلنے پر اصرار کیا تو وہ آپ کی دل شکنی کو برداشت نہ کر سکے اور ساتھ لے لیا۔

++

تیسرا باب

نبوت سے پہلے

فجار کی لڑائی :-

اسلام سے پہلے عربوں میں لڑائیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ ان ہی لڑائیوں میں سے ایک نہایت خطرناک اور مشہور لڑائی فجار کی لڑائی ہے۔ یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبیلوں کے درمیان ہوئی چونکہ قریش اس لڑائی میں برسر حق تھے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قریش کی طرف سے اس لڑائی میں شرکت کی لیکن آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس لڑائی میں پہلے قیس پھر قریش غالب آئے اور آخر کار صلح پر لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔

حلف الفضول:-

آئے دن کی لڑائیوں سے سیکڑوں گھرانے برباد ہو گئے۔ لوگوں کے لئے نہ دن کو چین تھا اور نہ رات کو آرام، فجار کی لڑائی کے بعد اس صورت حال سے تنگ آ کر کچھ خیر پسندوں نے اصلاح کی ایک تحریک شروع کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا زبیر ابن عبدالمطلب نے یہ تجویز پیش کی کہ اب حالات کو سدھارنے کے لئے کچھ کرنا چاہیے چنانچہ خاندان قریش کے بڑے بڑے لوگ جمع ہو گئے۔ اور یہ معاہدہ ہوا کہ ہم۔

۱- ملک سے بے امنی دور کریں گے۔

۲- مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے۔

۳- غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے۔

۴- مظلوم کی حمایت کریں گے۔

۵- کسی ظالم کو مکے میں نہ رہنے دیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس معاہدہ میں شریک تھے اور آپ کو یہ شرکت بڑی عزیز تھی۔ چنانچہ زمانۂ نبوت میں آپ نے فرمایا۔ ''اس معاہدے کے بدلے میں اگر مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جاتے تو میں نہ لیتا۔ اور آج بھی ایسے معاہدے کے لئے کوئی مجھے بلائے تو میں حاضر ہوں۔''

کعبے کی تعمیر:-

کعبے کی عمارت صرف چار دیواری تھی اوپر چھت نہ تھی۔ دیواریں بھی بس اتنی اونچی تھیں جتنا آدمی کا قد، پھر عمارت نشیب میں بھی تھی بارش کے زمانے میں شہر کا پانی بہہ بہہ کر ادھر آتا تھا جسے روکنے کے لئے بند بنا دیا گیا تھا۔ لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا اور اس جگہ پانی بھر جاتا تھا اس طرح عمارت کو نقصان پہنچتا تھا۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ عمارت کو ڈھا کر پھر سے ایک مضبوط عمارت بنائی جائے۔ تمام قریش نے مل کر تعمیر کا کام شروع کیا۔ مختلف قبیلوں نے عمارت کے مختلف حصے آپس میں بانٹ لئے تاکہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے۔ لیکن جب حجر اسود[۱] کے نصب کرنے کا موقع آیا تو بڑا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر قبیلے والے چاہتے تھے کہ یہ خدمت

۱- ایک سیاہ متبرک پتھر جو کعبہ کی دیوار میں لگا ہوا ہے۔

ہم ہی انجام دیں، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں نکل آئیں چار دن تک یہ جھگڑا ہوتا رہا۔ پانچویں دن قریش کے ایک بڑے بوڑھے نے یہ رائے دی کہ اچھا کل سویرے جو شخص سب سے پہلے آئے اسی کو پنچ مقرر کرلیا جائے۔ اور وہ جس طرح کہے اسی طرح کیا جائے۔ سب نے یہ بات مان لی دوسرے دن اللہ کی قدرت کہ سب سے پہلے جس شخص پر لوگوں کی نظر پڑی وہ رحمتِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ چنانچہ آپؐ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جس خاندان کے لوگ حجر اسود کو اس کے مقام پر نصب کرنے کے مدعی ہیں ان کا ایک ایک سردار چن لیا جائے۔ پھر آنحضرتؐ نے ایک چادر بچھا کر پتھر کو اس پر رکھا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے کونے تھام لیں اور پتھر کو اٹھائیں۔ جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپؐ نے حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھ دیا۔ اس طرح ایک ایسی لڑائی ٹل گئی جس کے نتیجے میں معلوم نہیں کتنا خون خرابہ ہوتا۔

اب جو کعبے کی عمارت بنائی گئی اس پر چھت بھی ڈالی گئی لیکن چونکہ تعمیر کا سامان کافی نہ تھا اس لئے ایک طرف زمین کا کچھ حصہ باہر چھوڑ کر نئی بنیادیں قائم کی گئیں یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں۔

تجارت:-

عربوں کا اور خصوصاً قریش کا پرانا مشغلہ تجارت تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب بھی تاجر تھے اسی لئے جب آپ جوان ہوئے تو آپ نے تجارت ہی کو بطور ذریعہ معاش اختیار فرمایا۔ اپنے چچا کے ساتھ بچپن میں جو سفر تجارت آپ نے فرمایا تھا اس سے کافی تجربہ حاصل ہوا تھا۔ پھر جب آپ نے

کاروبار میں ہاتھ ڈالا تو آپ کے اچھے معاملات کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی۔ لوگوں نے آپ کو معاملے کا کھرا اور انتہائی دیانت دار پایا اور اس لئے لوگ اپنا سرمایہ آپ کو شرکت کی غرض سے دینے لگے، وعدے کا پاس، معاملے کی صفائی، انتہائی راست بازی اور دیانت ان تمام چیزوں نے مل کر آپ کو لوگوں کی نظروں میں انتہائی معزز بنا دیا۔ اور عام طور پر لوگ آپ کو صادق (سچا) اور امین (امانت دار) کے لقب سے یاد کرنے لگے۔ تجارت کی غرض سے آپ نے شام بصریٰ اور یمن کے کئی سفر کیے۔

نکاح:-

حضرت خدیجہ ایک معزز اور مال دار خاتون تھیں۔ یہ آپ کے دور کے رشتے کی چچیری بہن بھی ہوتی تھیں۔ پہلی شادی کے بعد یہ بیوہ ہو گئیں تو دوسرا نکاح کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد دوسرے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا اور اب پھر یہ بیوہ تھیں۔ یہ نہایت شریف اور پاکیزہ اخلاق کی بی بی تھیں۔ لوگ ان کی شرافت کی وجہ سے ان کو طاہرہ (پاک) کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ نہایت دولت مند بھی تھیں۔ یہ اپنا سامانِ تجارت لوگوں کو دے کر تجارت کا کاروبار کرتی تھیں۔

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر 25 سال ہو چکی تھی۔ آپ کتنے ہی تجارتی سفر کر چکے تھے اور ان میں آپ کی سچائی امانت اور پاکیزہ اخلاق لوگوں کے سامنے آ چکے تھے۔ چنانچہ آپ کی شہرت سن کر حضرت خدیجہ نے یہ پیغام بھیجا کہ آپ میرا سامانِ تجارت لے کر شام جائیں، میں جو معاوضہ دوسروں کو دیتی ہوں وہ آپ کو دوں گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما لیا اور مال لے

کر بصریٰ تشریف لے گئے واپس آنے کے تقریباً تین مہینے بعد حضرت خدیجہ نے آپ سے شادی کا پیغام بھیجا آپ نے منظور فرمالیا اور تاریخ مقرر ہوگئی تاریخ مقررہ پر ابوطالب، حضرت حمزہ اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کے ساتھ آپ حضرت خدیجہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ ابوطالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانچ سو طلائی درہم پر نکاح ہو گیا۔

شادی کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی اور پہلے دو شوہروں سے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی موجود تھیں۔

غیر معمولی واقعات:-

دنیا میں جتنے ممتاز لوگ ہوئے ہیں اُن کی زندگی میں شروع سے ہی ایسے آثار پائے جاتے ہیں جن کو دیکھ کر ان کے روشن مستقبل کے بارے میں اندازہ ہونے لگتا ہے یہ تو اُن لوگوں کا حال ہے جو آگے چل کر کسی خاندان، قوم یا ملک کی زندگی کے کسی گوشے میں کوئی اصلاحی کام کرتے ہیں لیکن جو مقدس ہستی قیامت تک سارے عالم کی رہنمائی کے لئے پیدا کی گئی ہو اور جس کے دم سے انسانی زندگی کے ہر ہر گوشے کی اصلاح ہونے والی ہو اس کی ابتدائی زندگی میں تو ایسے آثار جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے غیر معمولی ہو بکثرت ملنا چاہئیں۔ یوں تو اس قسم کے آثار کے تذکرے سیرت کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں لیکن جو واقعات تحقیق کی روشنی میں صحیح روایتوں میں ذکر ہوئے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ''جب میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا تو اُنھوں نے

ایک خواب دیکھا کہ اُن کے بدن سے ایک نور نکلا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔'' بہت سی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں یہود و نصاریٰ خاص طور سے ایک آنے والے نبی کے منتظر تھے اور اس بارے میں مختلف پیشن گوئیاں کیا کرتے تھے۔

آپ کے بچپن کا واقعہ ہے کہ خانۂ کعبہ میں کچھ تعمیر ہو رہی تھی اور بڑوں کے ساتھ بچے بھی اینٹیں اُٹھا اٹھا کر لانے میں شریک تھے ان بچوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ اپنا تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو تو اینٹوں کی رگڑ سے تکلیف نہ ہوگی۔ عرب کے ماحول میں یہ بات کچھ عجیب نہیں تھی بچے تو کیا وہاں تو بڑے بھی ننگے ہونے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے لیکن جب آپ نے ایسا کیا تو برہنگی کے احساس سے آپ فوراً بے ہوش ہو کر گر پڑے اور آنکھیں پھٹ کر آسمان کو لگ گئیں۔ جب ہوش آیا تو آپ کہہ رہے تھے میرا تہبند، میرا تہبند، لوگوں نے جلدی سے تہبند کمر سے باندھ دیا۔ ابوطالب نے اس کے بعد جب آپ سے کیفیت دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ مجھے سفید کپڑے پہنے ہوئے ایک مرد نظر آیا جس نے مجھ سے کہا ''ستر پوشی کر'' غالباً یہ غیب کی پہلی آواز تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنی۔

عرب میں داستان گوئی کا عام رواج تھا۔ لوگ راتوں کو کسی جگہ جمع ہوتے اور کوئی داستان گو رات رات بھر داستان سناتا رہتا۔ بچپن میں ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جلسے میں شریک ہونے کا ارادہ کیا لیکن

اتفاق سے راستے میں شادی کا کوئی جلسہ تھا آپ اُسے دیکھنے کے لئے ٹھہرے وہیں نیند آ گئی آنکھ کھلی تو سویرا ہو چکا تھا۔ ایسا ہی واقعہ ایک مرتبہ اور بھی پیش آیا اور اس بار بھی آپ اتفاقی طور پر سو گئے۔ اس طرح آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس صحبت سے بچالیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں پیدا ہوئے۔ مکہ بت پرستی کا سب سے بڑا اڈّا بنا ہوا تھا۔ خانۂ کعبہ میں تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا ہوتی تھی اور آپ کے خاندان والے یعنی قریش اس وقت خانۂ کعبہ کے متولی یا پجاری تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا اور نہ وہاں کی مشرکانہ رسموں میں کبھی کوئی حصہ لیا۔ اس کے علاوہ بھی قریش جن غلط رسموں کے عادی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ان رسموں کے بارے میں اپنے خاندان کا ساتھ نہیں دیا۔

✦✦

چوتھا باب

نبوّت کی ابتدا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اب ایک اور انقلاب رونما ہونے لگا۔ آپ کی توجہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرنے اور اپنے ماحول کی اخلاقی اور دینی پستی پر غور کرنے کی طرف بڑھنے لگی۔ آپ برابر سوچا کرتے تھے کہ میری قوم کے لوگوں نے کس طرح بتوں کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ وہ اخلاقی اعتبار سے کس قدر گر چکے ہیں۔ ان کی یہ برائیاں کیسے دور ہوں؟ اُنھیں کیسے بتایا جائے کہ سچی خداپرستی کی راہ کیا ہے؟ اس کائنات کے واقعی خالق اور مالک کی عبادت کس طرح ہونی چاہیے۔ اسی طرح کے سیکڑوں خیالات اور سوالات تھے جو برابر آپ کے ذہن میں گھوما کرتے تھے اور آپ اُن پر گھنٹوں سوچا کرتے تھے۔

غارِ حرا:-

مکہ معظّمہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک غار تھا جسے حرا کہتے ہیں۔ آپ اکثر وہاں جا کر قیام فرماتے اور غور و فکر اور عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے جب ختم ہو جاتا تو پھر آ کر لے جاتے یا حضرت خدیجہؓ پہنچا دیتیں۔

پہلی وحی:-

ایک دن آپ غارِ حرا میں حسبِ معمول عبادت میں مصروف تھے۔ رمضان کا

مہینہ تھا کہ آپ کے سامنے اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ ظاہر ہوا۔ یہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے جو فرشتوں میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں اور جو ہمیشہ سے خدا کا پیام اُس کے رسولوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ حضرت جبریلؑ نے نمودار ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ''پڑھ'' آپ نے فرمایا۔ ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' یہ سن کر حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر اتنا بھینچا کہ آپ تھک گئے۔ پھر آنحضرتؐ کو چھوڑ دیا اور کہا ''پڑھ'' آپ نے پھر وہی جواب دیا اور اُنھوں نے پھر آنحضرتؐ کو پکڑ کر بھینچا اور چھوڑ کر کہا ''پڑھ'' آپ نے پھر فرمایا۔ ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اب حضرت جبریلؑ نے تیسری بار وہی کیا اور چھوڑ کر کہا:۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۰ خَلَقَ الْاِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۰ اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ

ترجمہ:۔اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

یہی سب سے پہلی وحی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے بعد گھر تشریف لائے۔ اُس وقت آپ کے قلب مبارک پر ایک طرح کا لرزہ[1] طاری تھا۔ آپ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا ''مجھے کمبل اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ''

---

[1] یہ لرزہ اس ذمہ داری کے احساس کی وجہ سے تھا جو اچانک آپ پر ڈال دی گئی تھی اور آپ نے جو کچھ فرمایا اور حضرت خدیجہؓ نے جس طرح تسلی دی وہ ایک خاص فطری کیفیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آپ کو کمبل اڑھا دیا گیا۔ جب آپ کو کچھ سکون ہوا تو آپ نے حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کیا اور فرمایا۔ ''مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔'' حضرت خدیجہؓ نے کہا نہیں ہرگز نہیں آپ کی جان کو خطرہ نہیں، خدا آپ کو رسوا نہ کرے گا۔ آپ قرابت داروں کا حق ادا کرتے ہیں لوگوں کے بوجھ کو آپ خود اٹھاتے ہیں، فقیروں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہیں۔ مسافروں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ انصاف کی خاطر آپ لوگوں کی مصیبتوں میں کام آتے ہیں۔'' اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ یہ ایک بوڑھے دین دار عیسائی تھے۔ توریت پڑھتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے سارا واقعہ اُنھیں جا کر سنایا ورقہ سن کر بولے۔ ''یہ وہی ناموس (چھپے بھیدوں کا جاننے والا فرشتہ) ہے جو موسیٰ پر اُتارا گیا۔ اے کاش میں اُس وقت زندہ ہوتا جب تمھاری قوم تمھیں نکال دے گی'' آپ نے پوچھا کیا میری قوم مجھے نکال دے گی۔ اُنھوں نے کہا ہاں اور یہ بھی کہا کہ جو کچھ لے آئے ہو اُس کو لے کر جو کوئی بھی آیا۔ اُس سے اُس کے لوگوں نے دشمنی ہی کی۔ اگر میں اُس وقت تک زندہ رہا تو تمھاری مدد کروں گا اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد حضرت جبریلؑ کی آمد رکی رہی اور آپ بدستور غار حرا میں جاتے رہے یہ عرصہ کم سے کم چھ ماہ کا رہا۔ اس درمیانی وقفہ سے یہ فائدہ ہوا کہ آپ کے قلب پر جو فوری اثرات بتقاضائے بشریت پیدا ہوئے تھے وہ دور ہو گئے اور آپ کا قلب مبارک اب پھر نزولِ وحی کا مشتاق ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب یہ عرصہ کچھ دراز ہوا تو آپ کے سکون اور اطمینان کے لئے کبھی کبھی حضرت

جبریلؑ تشریف لاتے رہے اور آپ کو اطمینان دلاتے رہے کہ یقیناً آپ کا انتخاب بحیثیت رسول ہو چکا ہے، آپ انتظار اور اطمینان فرمائیں پھر کچھ دنوں بعد حضرت جبریلؑ پے در پے آنے لگے۔

++

پانچواں باب

دعوت کی ابتدا

غارِ حرا میں پہلی وحی کے نازل ہونے کے بعد کچھ دنوں تک کوئی وحی نہیں آئی۔اس کے بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں:۔

يَاَيُّهَاالْمُدَّثِّرُ ہقُمْ فَاَنْذِرْ ہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ہ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ہ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ہ وَلَاتَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ہ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ہ (مُدَّثِّر)

ترجمہ:۔اے کملی اوڑھنے والے! اٹھ (اور لوگوں کو گمراہی کے انجام سے) ڈرا اور اپنے رب کی بزرگی اور بڑائی بیان کر اور لباس کو پاک کر اور بتوں سے الگ رہ اور زیادہ حاصل کرنے کی نیت سے کسی کے ساتھ احسان مت کر اور اپنے رب کے معاملے میں اذیت اور مصیبت پر صبر اختیار کر۔

نبوت کے کام پر مامور ہونے کی یہ ابتدا تھی اب باضابطہ حکم مل گیا کہ اٹھو اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو اس کی فلاح اور کامرانی کا راستہ دکھاؤ اور لوگوں کو خبر دار کردو کہ کامیابی کی راہ صرف ایک ہی ہے یعنی خدائے واحد کی بندگی۔جو کوئی اس راہ کو اختیار کرے گا وہی کامیاب ہوگا اور جو کوئی اس کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرے اُسے آخرت کے برے انجام سے ڈراؤ۔انسانی زندگی کی بنیاد صرف

ایک خدا کی بندگی اور اس کی عظمت و کبریائی کے اعتراف پر ہونا چاہیے اسی صورت میں وہ ہر قسم کی ظاہری ناپاکیوں اور اندرونی گندگیوں سے پاک رہ سکتی ہے۔ خدا کے علاوہ دوسروں کی بندگی، یہی وہ بس کی گانٹھ ہے جو انسان کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ انسانوں کو آپس میں حسن سلوک کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ایسا حسن سلوک جس کی بنیاد کسی غرض اور لالچ پر نہ ہو۔

دعوت کے دو دور:-

یہاں سے اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دعوتی دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کو ہم دو بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ حصہ جو ہجرت سے پہلے مکے میں بسر ہوا جسے مکی دور کہتے ہیں۔ اور دوسرا وہ حصہ جو ہجرت کے بعد مدینے میں گذرا اور جسے مدنی دور کہتے ہیں۔ پہلا دور 13 سال اور دوسرا دس سال کے قریب رہا۔

مکی زندگی:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا وہ دور جو مکے میں گذرا، اپنے نتائج کے اعتبار سے نہایت درجہ اہم ہے۔ دراصل یہی وہ دور ہے جس میں اسلام کی کھیتی کی تخم ریزی ہوئی۔ یہی وہ دور ہے جس میں انسانیت کے ایسے ایسے اعلیٰ نمونے تیار ہوئے جنھوں نے اسلامی تحریک کو سارے عالم میں روشناس کرایا۔

تاریخ اور سیر کی جو کتابیں اس وقت موجود ہیں اُن میں مکی دور کی تفصیلات بہت ہی کم ملتی ہیں۔ اس دور کی اہمیت اور اس کے سبق آموز حالات کو جاننے

کے لئے قرآنِ پاک کے اُس حصے کا بغور مطالعہ ضروری ہے جو مکے میں نازل ہوا۔ دراصل مکی دور کی صحیح اہمیت کا اندازہ اُسی وقت ہوسکتا ہے جب مکی سورتوں کے اندازِ دعوت، اُس وقت کے حالات اور واقعات کی تفصیل، توحید وآخرت کے دلائل کردار اور سیرت کی تعمیر کے لئے ہدایات اور حق و باطل کی انتہائی صبر آزما کشمکش کے دوران تحریک کو آگے بڑھانے اور تحریک کے علم برداروں کو اُن کے مقام پر قائم رکھنے کی جدوجہد کی تفصیلات سامنے آئیں۔ ان تفصیلات کا علم قرآن پاک کے براہِ راست اور بغور مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔ البتہ یہاں ہم کچھ مختصر طور پر اس دور کی تفصیلات بیان کریں گے۔

مکی زندگی کے چار دور:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا وہ حصہ جو ہجرت سے پہلے مکے میں بسر ہوا اور جس میں اسلامی تحریک، دعوت کے مختلف مرحلوں اور کشمکشوں سے ہوکر گذری، اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے چار مختلف دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور:- نبوت کے بعد سے لے کر تقریباً تین سال تک جس میں آپ دعوت وتبلیغ کا فرض خفیہ طور پر انجام دیتے رہے۔

دوسرا دور:- نبوت کے اعلان سے لے کر تقریباً دو سال تک جس میں پہلے تو کچھ مخالفت ہوئی، پھر ہنسی اڑائی گئی۔ مختلف الزامات تراشے گئے۔ برا بھلا کہا گیا اور جھوٹے پروپیگنڈوں اور مخالفانہ گفتگوؤں سے دعوتِ اسلامی کو دبانے کی کوشش کی گئی۔

تیسرا دور:۔ جب اس پر بھی تحریک اسلامی برابر بڑھتی گئی تو پھر ظلم وستم کا دور شروع ہوا اور مسلمانوں پر زیادتیاں ہونے لگیں۔ یہ دور تقریباً پانچ چھ سال تک رہا اور اس میں مسلمانوں کو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔

چوتھا دور: ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد سے لے کر ہجرت تک تقریباً تین سال یہ دور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے انتہائی سختی اور مصیبت کا زمانہ تھا۔

پہلا دور

خاموش دعوت

کارِ نبوت پر مامور کیے جانے کے بعد سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ صرف ایک خدا کی بندگی اختیار کرنے اور باقی سیکڑوں خداؤں کا انکار کر دینے کی دعوت سب سے پہلے کسے دی جائے۔ قوم اور ملک کے لوگوں کی جو حالت تھی اُس کا ایک ہلکا سا نقشہ ہم اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے وہ بات پیش کرنا جو اُن کے مزاج، پسند اور عادتوں کے بالکل خلاف ہو، واقعی بڑا سخت مرحلہ تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اُن لوگوں کو منتخب فرمایا جن سے اب تک بہت قریبی تعلقات رہے تھے۔ اور جو آپ کی عادات اور اخلاق کا براہِ راست تجربہ رکھتے تھے۔ آپ کی سچائی اور دیانت کے بارے میں قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔ اور اُن کے لئے یہ آسانی سے ممکن نہ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی کسی بات کا انکار کر سکیں۔ ان لوگوں میں سب سے زیادہ محرم راز حضرت خدیجہؓ تھیں پھر اس کے بعد حضرت علی،

حضرت زید اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم تھے۔ حضرت علیؓ آپ کے چچازاد بھائی حضرت زید غلام اور حضرت ابوبکر دوست تھے۔ یہ لوگ برسوں سے آپ کی صحبت سے فیضیاب ہو رہے تھے چنانچہ سب سے پہلے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سنایا اور اس کے بعد دوسرے لوگوں تک بات پہنچائی، یہ سب کے سب گویا کہ پہلے سے مومن تھے، سنا اور تصدیق کی۔ یہی لوگ سب سے پہلے صاحب ایمان تھے پھر اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی ترغیب اور ہدایت سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعد بنؓ ابی وقاص اور حضرت طلحہؓ ایمان لائے۔ اس طرح اسلام کی دعوت چپکے چپکے پھیلتی رہی اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔

قرآن کی تاثیر:-

اس دور میں جو قرآن نازل ہو رہا تھا وہ دعوت کے ابتدائی مرحلے کی مناسبت سے چھوٹے چھوٹے بولوں پر مشتمل ہوتا تھا جن کی زبان نہایت ہی عمدہ شیریں اور انتہائی پُر اثر تھی۔ پھر ان میں ایسا ادبی رنگ تھا کہ سننے والے پر فوراً ہی اثر پڑتا تھا اور یہ بول دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اتر جاتے تھے۔ جو سنتا تھا وہ اثر قبول کرتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان بولوں کو بار بار دہرائے۔

اعتقادات کی اصلاح:-

قرآن پاک کی ان سورتوں میں توحید اور آخرت کی حقیقتیں بیان کی جاتی تھیں اور ان کے بارے میں ایسے ثبوت پیش کیے جاتے تھے جو دلوں میں اتر جائیں۔ اس کے لئے سننے والوں کے قریبی ماحول سے ہی دلائل اور شواہد

پیش کیے جاتے تھے اور یہ باتیں ایسے انداز میں پیش کی جاتی تھیں جن سے مخاطب اچھی طرح مانوس تھے ان ہی کی تاریخ کے واقعات اور ان ہی کی روایات کی بنیادوں پر اصل بات کو سمجھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اعتقادات کی ان گمراہیوں کا ذکر کیا جاتا تھا جن میں یہ لوگ اس وقت پھنسے ہوئے تھے اور ان اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں کا تذکرہ ہوتا تھا جن سے وہ لوگ خود واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جو کوئی اس کلام کو سنتا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تن تنہا اس دعوت کو شروع کیا۔ لیکن یہی قرآن پاک کی ابتدائی آیات کا نزول تھا جو اس میدان میں سب سے زیادہ کارگر ہتھیار کا کام دے رہا تھا اور دعوت آہستہ آہستہ خاموشی سے پھیل رہی تھی۔

اس دور میں دعوت وتبلیغ کے لئے توحید وآخرت کے دلائل کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر اس امر کی تعلیم بھی دی جارہی تھی کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لئے کس طرح تیار کریں اور اس اہم کام کو انجام دینے کے لئے کیا کیا صورتیں اختیار کریں۔

چھپ کر نمازیں:-

ابھی جو کچھ ہو رہا تھا پوشیدہ طور پر ہو رہا تھا۔ نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ قابل اعتماد لوگوں کے علاوہ بات کہیں باہر نہ جائے۔ جب نماز کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے۔ ایک دفعہ آپؐ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درّے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے آپ کے چچا ابو طالب آنکلے اور عبادت کے اس نئے طریقے کو

دیر تک تعجب کے ساتھ دیکھتے رہے۔ نماز کے بعد پوچھا۔ ''یہ کون سا دین ہے؟''
آنحضرت نے فرمایا۔ ''ہمارے دادا ابراہیمؑ کا دین ہے۔'' ابو طالب بولے۔
''خیر میں تو اسے اختیار نہیں کرسکتا لیکن تم کو اجازت ہے کوئی شخص تمھاری
مزاحمت نہ کر سکے گا۔''

اس دور کے مومنین کی خصوصیات:-

اس ابتدائی دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت اسلام قبول کرنا اور پھر
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینا گویا جان پر کھیل جانا تھا۔ اس دور میں
جن لوگوں نے آگے بڑھ کر اس دعوت کو قبول کیا ان میں یقیناً کچھ ایسی
خصوصیات تھیں جن کی بنیاد پر وہ اس میدان میں آگے بڑھ سکے۔ اُن کی چند
مشترک خصوصیات یہ ہیں کہ یہ لوگ پہلے سے مشرکانہ رسوم وعبادات سے بیزار
تھے اور حق کی تلاش میں تھے۔ طبیعت کے اعتبار سے یہ لوگ نیک اور پاکیزہ
اخلاق والے تھے۔

تقریباً تین سال تک دعوت وتبلیغ کا کام پوشیدہ طور پر ہوتا رہا لیکن آخر کب
تک؟ جس آفتاب کو اپنے نور سے سارے عالم کو روشن کرنا تھا اُسے تو بہر حال
سامنے آکر نگاہوں کو خیرہ کرنا ہی تھا چنانچہ اب دعوت اپنے دوسرے مرحلے میں
داخل ہوئی۔

دوسرا دور

اعلان دعوت

اب صاف حکم مل گیا کہ دعوت علی الاعلان دی جائے۔ چنانچہ ایک دن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر تشریف لے گئے اور وہاں کھڑے ہو کر پکارا ''یا صباحا!۔'' عرب میں دستور تھا کہ اگر کوئی خطرہ درپیش ہوتا تو کوئی شخص کسی اونچی جگہ پر چڑھ کر یہ الفاظ پکارتا تھا اور لوگ اس پکار کو سن کر جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جب کوہ صفا سے آنحضرت نے یہ ندا بلند فرمائی اور اہل قریش کو پکارا تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ان لوگوں میں آپ کا چچا ابولہب بھی تھا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک بڑا لشکر جمع ہے اور تم پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہے تو کیا تم میری بات کو سچ مانو گے؟'' لوگوں نے کہا۔ ''بے شک سچ مانیں گے تم نے اب تک کوئی بات جھوٹ نہیں کہی ہے اور ہم تمھیں صادق اور امین جانتے ہیں۔'' تب آپ نے فرمایا ''لوگو! میں تمہیں ایک خدا کی بندگی کی طرف بلاتا ہوں اور بتوں کی پوجا سے بچانا چاہتا ہوں لیکن اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو میں تمھیں ایک بہت سخت اور دردناک عذاب سے ڈراتا ہوں۔''

جب قریش نے یہ بات سنی تو سخت ناراض ہوئے اور ابولہب نے نہایت غضبناک ہو کر کہا۔ ''کیا بس تو نے اسی کے لئے ہمیں پکارا تھا؟''

اسلامی دعوت کی یہ عام پکار تھی۔ اب خدا کے رسول نے صاف صاف کھل کر اعلان کر دیا کہ اُسے کیا کہنے پر مامور کیا گیا ہے اور وہ کون سی شاہراہ ہے جس کی طرف وہ ہر ایک کو بلا رہا ہے۔ زبان نبوت سے اب اس بات کا اعلان ہو گیا کہ دراصل اس بے پایاں مملکت کا خالق اور مالک صرف اللہ ہے۔ انسان کو بھی اُسی نے پیدا کیا ہے اور وہی اُس کا مالک بھی ہے۔ انسان کا مقام اس کے سوا اور کچھ

نہیں کہ وہ اللہ کا بندہ اور غلام ہے اُسی کی تابعداری اور فرماں برداری کرنا اُس کا فرض ہے۔ اُس کو چھوڑ کر دوسروں کے آگے سر جھکانا یا اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا انسان کے اس منصب کے خلاف ہے جو اس کو اس کے مالک کی طرف سے عطا ہوا ہے حقیقت میں صرف ایک اللہ ہی انسان کا اور تمام جہان کا خالق، معبود اور حاکم ہے۔ اس کی اس سلطنت میں انسان نہ خود مختار ہے اور نہ کسی دوسرے کا بندہ۔ انسان کے لئے اللہ کے سوا کوئی دوسرا اطاعت، بندگی اور پرستش کا مستحق نہیں۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ اختیارات دے کر بھیجا ہے۔ دراصل اس کے لئے ایک امتحان کی مدت ہے۔ جس کے بعد اُسے لازماً اللہ کے پاس جانا ہوگا اور وہ انسان کے تمام کاموں کی جانچ کر کے فیصلہ کرے گا کہ انسانوں میں سے کون اس امتحان میں کامیاب رہا اور کون ناکام۔

یہ اعلان کوئی معمولی اعلان نہ تھا اس نے قریش اور دوسرے لوگوں میں ایک آگ لگادی اور چہار طرف اس دعوت کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ چند روز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ دعوت کا سامان کرو۔ اس دعوت میں تمام خاندان عبدالمطلب کو بلایا گیا۔ اس میں حمزہ، ابوطالب، عباس سب شریک تھے۔ کھانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ ''میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کے لئے کافی ہے۔ اس بارگراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا اس بارگراں کے اٹھانے

4

میں ساتھ دینے کا مطلب یہ تھا کہ نہ صرف خاندان، قبیلے اور شہر کے لوگوں کی بلکہ سارے عرب کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لئے آدمی تیار ہو جائے اور صرف اس لئے تیار ہو جائے کہ اس کے بدلے میں آخرت کی زندگی کامیاب ہوگی اور بندہ اپنے مالک کے حضور سرخروئی حاصل کرے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا فائدہ دور دور تک نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ ساری مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ اٹھے تو کمسن حضرت علیؓ اٹھے اور فرمایا: ''اگر چہ میری آنکھیں آئی ہوئی ہیں۔ (اس وقت آپ کی آنکھیں دکھ رہی تھیں) گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میں سب سے کم عمر بھی ہوں۔ تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔'' قریش کے لئے یہ منظر بھی عجیب تھا کہ ایک تیرہ سالہ نوعمر بلا کچھ سوچے سمجھے کتنا بڑا فیصلہ کر رہا ہے۔

دعوت کی مخالفت:-

اس وقت تک اسلامی جماعت میں چالیس سے کچھ زیادہ آدمی داخل ہو چکے تھے۔ اب ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان فرمایا۔ مشرکین کے نزدیک یہ حرم کعبہ کی سب سے بڑی توہین تھی۔ اس اعلان کے کرتے ہی ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا ہر طرف سے لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت حارث بن ابی ہالہ آپ کی مدد کے لئے دوڑے۔ لیکن ان پر چاروں طرف سے اتنی تلواریں پڑیں کہ وہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلی شہادت تھی۔ اللہ کے فضل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہے اور کسی نہ کسی طرح ہنگامہ فرو ہو گیا۔

مخالفت کے اسباب:-

اسلامی دعوت کا یہ اعلان سب سے زیادہ قریش کے لئے پریشانی کا موجب تھا اور وہی اس دعوت کے سب سے سخت مخالف بھی تھے۔ اس وقت مکے کی جو عزت تھی وہ کعبہ کی وجہ سے تھی۔ قریش کا خاندان کعبے کا مجاور اور متولی تھا اور اس طرح گویا قریش کی ایک قسم کی مذہبی حکومت تقریباً سارے عرب پر قائم تھی۔ مذہب کے معاملے میں لوگ ان کی طرف دیکھتے تھے۔ اور اکثر ان کی رہنمائی پر اعتماد کرتے تھے۔ اسلامی دعوت کی سب سے پہلی اور سب سے سخت چوٹ اسی مذہب پر پڑتی تھی جس کی نمائندگی قریش کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ باپ دادا کے مذہب کے ساتھ جاہل قوموں کو جیسی کچھ اندھی عقیدت ہوتی ہے اس کے مقابلے میں وہ کسی معقول بات کو سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس نئی دعوت کو سن کر آگ بگولہ ہو جاتے تھے۔ پھر قریش کے بااقتدار لوگوں کو یہ بھی صاف نظر آرہا تھا کہ اس دعوت کے پھولنے پھلنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ان کا سارا اقتدار مٹی میں مل جائے گا اور اُنھیں جو مذہبی قیادت کا مقام حاصل ہے وہ آپ سے آپ ختم ہو جائے گا، اس لحاظ سے جو شخص جتنی بڑی گدی کا مالک تھا اتنا ہی زیادہ وہ اسلامی تحریک کی مخالفت میں سرگرم تھا۔ پھر قریش میں بہت سی بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے لوگ ان برائیوں میں مبتلا تھے اور باوجود اس سب کے ان کا مذہبی مقام ان کو لوگوں کی نظروں میں گرنے نہیں دیتا تھا کیونکہ ان کے تقدس اور مقام کی وجہ سے لوگ ان کی کمزوریوں پر نظر ہی نہیں ڈالتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے اوراس کے مقابلے میں خالص توحید کی دعوت دیتے تھے۔آخرت کی جواب دہی کا احساس اور خدا کے حضور حاضر ہونے کا خوف دلاتے تھے۔دوسری طرف وہ انسانی بنیادی اخلاقیات کی ایک ایک کمزوری کوکھل کر بیان فرماتے تھے۔ان کے انجام سے ڈراتے تھے اوران سب سے بچنے کی ہدایت کرتے تھے۔اس قسم کی باتیں ان ''بڑے''لوگوں کوسخت پریشانی میں مبتلا کردیتی تھیں، کیونکہ بہرحال وہ باتیں ایسی تو تھیں نہیں، جنھیں وہ صحیح کہہ سکتے لیکن چونکہ خودان کے دامن ان برائیوں سے پاک نہیں تھے۔اور نہ وہ ان برائیوں کوچھوڑنے کی ہمت اپنے اندر پاتے تھے۔اس لئے جب عوام کے سامنے یہ باتیں آتیں تو اُنھیں محسوس ہوتا کہ عوام کی نظروں میں ان کا مقام گررہاہےاوراگرسامنےنہیں تو پیچھےضروران کے بارے میں نکتہ چینیاں ہورہی ہیں۔ یہ بات اُن کی جھنجھلاہٹ کو بڑھانے کے لئے بہت کافی تھی۔قرآن مجید میں برابرایسے بدکاروں اور بداخلاقوں کے لئے آیتیں نازل ہورہی تھیں اوران کے ان کرتوتوں کے لئے سخت سے سخت عذاب کی دھمکیاں دی جارہی تھیں۔ان آیتوں میں اگرچہ بات بالکل عام انداز میں کہی جارہی تھی لیکن جب یہ آیتیں لوگوں میں پھیلتیں تو ہر شخص محسوس کرلیتا کہ پانی کہاں مررہاہے۔

تحریکِ اسلامی کی مخالفت اوردشمنی کے لئے یہ تمام اسباب اتنے کافی تھے کہ ہوسکتا تھا کہ یہ صاحبانِ اقتداراسلامی جماعت کےتھوڑے سے افراد کے خلاف تلوار لے کر اٹھ کھڑے ہوتے اور اس ''خطرے'' کا یکبارگی سدباب

کر دیتے۔ لیکن مشیت الٰہی میں تو یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ انہی مٹھی بھر انسانوں کے ہاتھوں سارے عالم کو اللہ کی وہ رحمت پہنچنا ہے جو رہتی دنیا تک انسانیت کی نجات کا واحد حل ہے۔ اس لئے اس وقت کچھ ایسے اسباب بھی فراہم ہو گئے تھے جن کی وجہ سے قریش یہ اقدام نہیں کر سکتے تھے۔

مخالفوں کی مجبوریاں:-

قریب ہی زمانے میں قریش خانہ جنگیوں کے باعث تباہ ہو چکے تھے۔ جنگ فجار کے بعد لڑائی سے اتنے عاجز آ گئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے۔ پھر یہ تھوڑے سے مسلمان جو مختلف قبیلوں سے چھٹ کر اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے تھے ان کے قتل کا مطلب یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبیلوں سے جنگ چھڑ جائے کیوں کہ اس وقت کسی ایک شخص کا قتل دراصل اس قبیلے کے خلاف اعلانِ جنگ تھا جس سے اس شخص کا تعلق ہوتا۔ اس طرح اندیشہ تھا کہ کہیں سارا مکہ لڑائی کا میدان نہ بن جائے۔ چنانچہ اس مرحلے میں تحریک کو دبانے کے لئے کچھ دوسری تدبیریں اختیار کی گئیں۔

دعوت اور داعی کی ہنسی اڑائی گئی۔ غلط الزامات لگائے گئے راستے گلی میں گالیوں اور پھبتیوں سے تواضع کی گئی۔ نئے نئے انداز سے غلط اور جھوٹی باتیں منسوب کر کے پروپیگنڈا کیا گیا۔ مجنون اور پاگل کا خطاب دیا گیا۔ شاعر اور جادوگر کہہ کر مشہور کیا گیا۔ لوگوں کو روکا گیا کہ کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ سننے پائے۔

حالات کا مقابلہ:-

اس دور میں قرآن کی جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں ان حالات کا مقابلہ

کرنے کے لئے برابر ہدایات دی جارہی تھیں اور مخالفین کے اعتراضات کے معقول اور مناسب جوابات بھی دیے جارہے تھے مثلاً سورہ القلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین کی خاطر کے لئے فرمایا گیا آپ پر تو اللہ کا بڑا کرم ہے آپ مجنون نہیں۔ آپ پر تو اس کی بے انتہا عنایات ہیں۔ جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ کس کی عقل ٹھکانے نہیں ہے۔ آپ کے رب کو خوب معلوم ہے کہ کون سیدھے راستے پر ہے اور کون بھٹکا ہوا ہے۔ آپ اپنا کام کیے جایئے جو لوگ اس دعوت کو جھٹلا رہے ہیں، ان کا کہا ہرگز نہ مانیے وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ اپنی تحریک اور دعوت کے کام کو ذرا ڈھیلا کر دیں تو وہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔ لیکن آپ کا یہ کام نہیں کہ آپ ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کریں جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اس کو نہ ماننے والوں کا معاملہ آپ میرے اوپر چھوڑ دیں اُنھیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ انھیں جو ڈھیل دی جارہی ہے اس کا کیا مطلب ہے آپ ان سے کہہ دیجیے کہ کیا میں تم سے کچھ طلب کرتا ہوں یا اپنے فائدے کے لئے تم سے کچھ چاہتا ہوں یا میری بات کے خلاف تمھارے پاس کوئی معقول ثبوت ہے۔ ظاہر ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے لہٰذا آپ نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے کام پر جمے رہیے۔ آپ اور آپ کے ساتھی ان حالات کا مقابلہ نہایت صبر کے ساتھ کرتے رہیں۔ حالات اپنے وقت پر بدلیں گے۔

یہ تقریر ایک نمونہ ہے، اس قسم کی تقاریر برابر نازل ہوتی رہیں۔ صاف صاف بتا دیا گیا کہ داعی حق نہ مجنون ہے نہ کاہن، نہ شاعر ہے اور نہ جادوگر۔ کاہنوں، شاعروں اور جادوگروں کی خصوصیات سامنے رکھو اور دیکھو کہ داعی

حق میں ان میں سے کون سی بات پائی جاتی ہے وہ کلام جو پیش کرر ہا ہے وہ اخلاق جس کا مظاہرہ اس کے ہر کام سے ہورہا ہے اور وہ زندگی جو وہ تمھارے درمیان بسر کرر ہا ہے بھلا ان باتوں کو شاعروں، کاہنوں اور جادوگروں کی باتوں سے کیا نسبت۔

دعوت کی طرف لوگوں کی توجہ:-

اہل مکہ نے اس قسم کی غلط باتوں کومشہور کر کے لوگوں کوروکنے کی جتنی کوشش کی اتنا ہی لوگوں میں یہ اشتیاق بڑھا کہ آخر دیکھیں تو یہ صاحب کیا کہتے ہیں؟ چنانچہ جولوگ عرب کے دوسرے علاقوں سے مکے میں حج کے موقع پر یا دوسرے اوقات میں آتے رہتے تھے ان میں سے کتنے ہی چھپ چھپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں آکر جب آپ کے اخلاق کریمانہ کودیکھتے اور آیات الٰہی کو سنتے تو دل کی دنیا ہی بدل جاتی اور اب وہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر اسلام کی دعوت پھیلانے لگتے۔

جب یہ چرچا دوسرے شہروں میں پھیلا تو دور دراز علاقوں سے لوگ صرف آپ کے بارے میں دریافت حال کے لئے آنے لگے اس قسم کے واقعات میں حضرت ابوذرؓ کا واقعہ ایک اچھی مثال ہے۔ غِفار کا قبیلہ اُس راستے پر آباد تھا جس سے ہوکر قریش ملک شام کوتجارت کے لئے جایا کرتے تھے جب وہاں یہ بات پہنچی تو حضرت ابوؓذر کے دل میں بھی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ اُنھوں نے پہلے اپنے بھائی انیس کو مکے بھیجا کہ جاؤ دیکھو یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے؟ انیس مکے میں آئے اور حضور کے بارے میں دریافت کر کے

جب واپس ہوئے تو اپنے بھائی سے جا کر بیان کیا کہ وہ شخص نہایت ہی اعلیٰ اخلاق کا انسان ہے۔ اچھے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور ایک خدا کی بندگی کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے وہ جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہے۔"

حضرت ابوذرؓ کو اس مختصر بات سے تسکین نہ ہوئی۔ خود سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ مکے میں پہنچے تو ڈر کی وجہ سے کسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تک نہ پوچھ سکے حرم میں حضرت علیؓ سے ملاقات ہوگئی۔ تین دن ان کے یہاں مہمان رہے جب کہیں یہ ہمت ہوئی کہ اپنے سفر کی غرض ان سے بیان کریں۔ چنانچہ حضرت علیؓ آپ کو خدمت بابرکت میں لے گئے یہاں حاضر ہونے کے بعد حضرت ابوذرؓ نے اسلام قبول کرلیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ہدایت کی کہ اب اپنے قبیلے میں واپس جاؤ لیکن توحید خالص کا جو تازہ تازہ اثر دل پر ہوا تھا اس نے ساری مصلحتوں اور خوفوں کو دل سے دور کر دیا تھا۔ وہاں سے آتے ہی حرم میں آ کر پکارا۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

یہ سننا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور مارنا شروع کر دیا۔ وہ تو خیر ہوگئی کہ عین وقت پر حضرت عباس آ گئے اور انھوں نے مارنے والوں سے کہا کہ یہ غفار کے قبیلے کے آدمی ہیں اور تمھارا تجارتی راستہ ان کے قبیلے کے پاس سے ہو کر گذرتا ہے اگر اُنھوں نے تمھارا راستہ بند کرا دیا تو کیا کرو گے؟ یہ سن کر لوگوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔

حضرت ابوذرؓ جب اپنے قبیلے میں پہنچے اور جا کر اسلام کی دعوت دی تو تقریباً

آدھا قبیلہ اُسی وقت مسلمان ہوگیا۔ غِفار کے قریب ہی اسلم کا قبیلہ آباد تھا۔ ان کے اثر سے اُنھوں نے بھی اسلام کی دعوت قبول کر لی۔ غرض یہ کہ اسلام کی دعوت اس طرح پھیلنی شروع ہوگئی۔ یہ بات مخالفین کیلئے سخت اذیت اور تکلیف کا سبب بنتی رہی۔ چنانچہ اب ان میں سے کچھ لوگ مجبور ہو کر ابوطالب کے پاس شکایت لے کر گئے اس وفد میں تمام رؤسائے قریش شامل تھے۔ اُنھوں نے ابوطالب سے کہا کہ تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے۔ ہمارے باپ دادا کو گمراہ بتاتا ہے اور ہم سب کو غلط اور احمق کہتا ہے لہٰذا یا تو تم بیچ سے ہٹ جاؤ تو پھر ہم معاملہ کو آخری بار چکا ڈالیں یا پھر تم اُسے سمجھاؤ جب ابوطالب نے اندازہ کیا کہ اب بات بہت سخت ہوگئی ہے اور میں اکیلا کب تک سارے قریش کا مقابلہ کروں گا تو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بولے۔ ''پیارے بھتیجے! میرے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈال کہ میں اُٹھا نہ سکوں'' آنخضرتؐ نے جب دیکھا کہ اب ابوطالب کے قدم بھی ڈگمگائے جا رہے ہیں تو نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا۔ ''خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں تو تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ خدایا تو اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس کام پر نثار ہو جاؤں گا۔ آپ کے اس پختہ ارادے اور باہمت فیصلے کو سن کر ابوطالب کی بھی ہمت بندھی اور اُنھوں نے کہا کہ جا، کوئی تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔''

مخالفوں کی پیش کش:-

قریش جب اس طرف سے بھی مایوس ہوگئے تو آخری چارۂ کار کے طور پر

طے کیا کہ اگر سختی سے نہیں تو نرمی سے ہی اس نئی تحریک کا خاتمہ کر دیا جائے چنانچہ عتبہ بن ربیعہ کو آپ کی خدمت میں بھیجا اس نے آ کر کہا:۔

''محمد! آخر بتاؤ، تم چاہتے کیا ہو؟ کیا مکے کی حکومت چاہتے ہو؟ کسی بڑے گھرانے میں شادی کی خواہش ہے؟ یا دولت کے ڈھیر مطلوب ہیں؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں تم اس کے لئے کیوں یہ سب کچھ کرتے ہو ہم اس پر راضی ہیں کہ کُل مکہ تمھارے زیر فرمان ہو جائے یا اور جو کچھ چاہو وہ کر دیا جائے لیکن تم اپنی اس دعوت سے باز آ جاؤ۔''

مخالفین بیچارے اتنا ہی سوچ سکتے تھے ان کے ذہنوں میں یہ بات آتی ہی نہ تھی کہ کوئی تحریک چلائی جائے یا کوئی دعوت بلند کی جائے اور اس کے پیچھے کوئی چھپی ہوئی مادّی غرض نہ ہو۔ ان کے ذہن یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی کام صرف خدا کی خوشنودی اور محض اس کی اطاعت کے لئے بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ تو یہی جانتے تھے کہ جان اور مال کی بازی حکومت اور دولت ہی کے لئے لگائی جاتی ہے اُنھیں کیا معلوم تھا کہ آخرت کی دائمی زندگی کی کامیابی کے لئے بھی لوگ یہ سودا کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ عتبہ کو پورا یقین تھا کہ اس کی درخواست ضرور منظور ہو جائے گی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں قرآنِ پاک کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ جن میں توحید کی دعوت اور اپنی رسالت کی وضاحت کی گئی تھی۔

عتبہ یہ سن کر واپس ہو گیا اور اتنا اثر لے کر گیا کہ جب اس نے قریش کے سرداروں کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کی تو کہا کہ ''محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ

شاعری تو نہیں ہے کچھ اور چیز ہے۔ میری رائے ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اگر وہ کامیاب ہو گئے تو سارے عرب پر غالب آجائیں گے اور اس میں تمھاری بھی عزت ہے اور نہیں تو عرب خود اُنھیں فنا کر دے گا۔'' لیکن قریش نے یہ رائے منظور نہیں کی۔ اب ایک ہی چارہ باقی رہ گیا تھا جو ہر باطل اس مرحلے میں حق کے خلاف اختیار کیا کرتا ہے یعنی پورے تشدد اور زور کے ساتھ حق کی آواز کو دبانے کی کوشش۔ چنانچہ اب قریش نے یہی فیصلہ کیا کہ مسلمانوں پر اتنی سختیاں کی جائیں کہ وہ تنگ آکر اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔ جسے جہاں موقع ملے مسلمانوں کو ستائے اور اذیت دے۔

تیسرا دور

ابتلا و آزمائش

اب تک دعوتِ اسلامی کا جو کام ہوا تھا اس کا ردِ عمل تین صورتوں میں ظاہر ہوا تھا۔

(۱) کچھ نیک اور بھلے لوگوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور وہ ایک گروہ بن کر تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ہر قیمت پر آمادہ ہو گئے۔

(۲) بہت سے لوگ اپنی نادانی، خودغرضی یا اپنے باپ دادا کے دین کی اندھی عقیدت کی وجہ سے اس تحریک کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔

(۳) مکے اور قریش کی حدود سے نکل کر یہ نئی دعوت نسبتاً زیادہ وسیع حلقے تک پہنچنے لگی۔

اور اب یہاں سے اس نئی تحریک اور پرانی جاہلیت میں ایک سخت کشمکش شروع ہوئی۔ جو لوگ اپنے پرانے دین سے چمٹے رہنا چاہتے تھے اُنھوں نے

پوری قوت سے تحریک اسلامی کو مٹا ڈالنے پر کمر باندھ لی اور اسلام قبول کرنے والوں پر انتہائی وحشیانہ ظلم وستم ڈھائے اور ان کو ہر طرح سے عاجز کر دینے پر تل گئے۔ چنانچہ یہی وہ دور ہے جس میں قریش کے مظالم کے انتہائی عبرت ناک واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

عرب جیسے گرم ملک کی تیز دھوپ میں دوپہر کے وقت جلتی ہوئی ریت پر مسلمانوں ں کو لٹانا، ان کے سینوں پر بھاری بھاری پتھر رکھ کر دبانا، لوہے کو گرم کر کے داغ دینا اور پانی میں ڈبکیاں دینا، انتہائی بے دردی سے مارنا پیٹنا۔ غرض یہ کہ اور اسی قسم کے مظالم تھے جو مسلمانوں پر توڑے جانے لگے اگر چہ اس دور میں عام مسلمانوں کے لئے زندگی دوبھر کردی گئی تھی لیکن تاریخ میں جن مظلوموں کی داستانوں کے کچھ حصے نقل ہوئے ہیں ان میں سے بطور نمونہ چند یہ ہیں۔

حضرت خباب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آپ ام انمار کے غلام تھے۔ ابھی چھ سات آدمی ہی اسلام لائے تھے کہ آپ بھی اسلام سے مشرف ہوئے اور اسی ''جرم'' میں قریش کے مظالم کا نشانہ بنے۔ قریش نے ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اُنھیں چت لٹایا اور اوپر سے ایک شخص نے سینے پر پاؤں رکھ کر دبایا کہ کروٹ لینے نہ پائیں یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے ہی ٹھنڈے ہو گئے۔ مدتوں کے بعد حضرت خبابؓ نے ایک بار اپنی جلی ہوئی پیٹھ پر برص کے سے داغ دکھائے تھے۔

حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) آپ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ ٹھیک دوپہر کے وقت امیہ ان کو جلتی ہوئی ریت کے اوپر لٹاتا اور بھاری پتھر سینے پر رکھ

دیتا اور کہتا کہ اسلام سے انکار کر، نہیں تو یوں ہی گھٹ گھٹ کر مرْ جائے گا۔ لیکن اس وقت بھی انتہائی کرب کی حالت میں آپ کی زبان سے ''احد احد'' ہی نکلتا اور ان کا آقا ان کے گلے میں رسی باندھ کر لڑکوں کے حوالے کر دیتا اور وہ ان کو شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک گھسیٹتے پھرتے۔

حضرت عمّار (رضی اللہ عنہ) یمن کے رہنے والے تھے۔ یہ ان چند باہمت لوگوں میں سے ہیں جو بالکل ابتداء میں مسلمان ہوئے تھے۔ یہ جب اسلام لائے تو قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹا کر اتنا مارتے کہ یہ بے ہوش ہو جاتے۔

حضرت لبنیہ (رضی اللہ عنہا) یہ ایک کنیز تھیں۔ حضرت عمرؓ اپنے مسلمان ہونے سے قبل ان کو اتنا مارتے کہ خود تھک کر بیٹھ جاتے لیکن یہ اللہ کی بندی یہی کہتیں کہ اگر تم اسلام نہیں لاؤ گے تو خدا تم سے اس کا بدلہ لے گا۔

حضرت زبیرہ (رضی اللہ عنہا) یہ بھی حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں۔ ایک بار ابوجہل نے ان کو اتنا مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

غرض یہ کہ مردوں اور عورتوں میں بہت سے ایسے لاچار اور مجبور مسلمان تھے جو طرح طرح سے ستائے جا رہے تھے لیکن یہ تمام مظالم کسی ایک مسلمان کو بھی اسلام چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکے۔

جب ان بے کس اور بے قصور مسلمانوں پر مظالم توڑے جاتے تھے تو لازماً لوگ متوجہ ہوتے تھے اور ان کے دل یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ آخر وہ کون سا لالچ ہے۔ جو اِن لوگوں کو اتنی مصیبتوں کے باوجود اسلام سے چمٹے رہنے پر آمادہ کیے ہوئے ہے۔ سب جانتے تھے کہ یہ لوگ اپنے اخلاق، معاملات اور

دوسرے انسانی رشتوں کے اعتبار سے بہترین انسان ہیں اوران کا قصوراس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم سوائے ایک اللہ کے اور کسی کو اپنا رب (آقا، مالک اور معبود) نہیں بنائیں گے اور اطاعت وبندگی صرف اس کی کریں گے[1] ان مظلوم مسلمانوں کی یہ استقامت بہت سے لوگوں کے سامنے ایک بہت بڑا سوال بن کر آتی تھی اوران کے دلوں میں لازماً ایک قسم کی نرمی پیدا کرتی تھی اور وہ اس نئی تحریک کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی طرف مائل ہوتے تھے۔ اہل حق کی مظلومیت ہمیشہ حق کی کامیابی کا زینہ بنی ہے چنانچہ اب بھی ایک

[1] یوں دیکھنے میں یہ بات آج کل ہمارے لئے بہت معمولی بات ہوگئی ہے اور ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ آخر اتنی سی بات کہنے پر لوگوں کو کیوں اتنا ستایا جاتا تھا بات یہ ہے کہ ہمارے سامنے نہ تو لفظ رب کا پورا پورا مفہوم ہے اور نہ ہم عبادت کی پوری حدود کو سامنے رکھتے ہیں لیکن یہ لوگ جانتے تھے کہ ان کی زبان میں رب اور عبادت کے الفاظ کی وسعتیں کیا ہیں؟ چنانچہ جب یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے تو کہنے والے اور سننے والے دونوں جانتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ:۔

(۱) اللہ کے سوا کوئی دوسرا پروردگار نہیں ہے اور جب ایسا ہے تو پھر انسان کو اسی کا شکر گذار ہونا چاہیے اسی سے دعائیں مانگنا درست ہے اور محبت وعقیدت کے ساتھ اسی کے سامنے سرِ جھکانا بھی ٹھیک ہے اس کے سوا کوئی دوسرا پرستش کا مستحق نہ ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔

(۲) اللہ کے سوا کوئی دوسرا مالک اور آقا نہیں ہے اس لئے انسان کو اسی کا بندہ اور غلام بن کر رہنا چاہیے اس کے مقابلہ میں نہ تو خود اپنے آپ کو خود مختار سمجھے اور نہ کسی دوسرے کو، اس کے سوا کسی دوسرے کی غلامی اور محکومی درست نہیں۔

(۳) اللہ کے سوا کوئی دوسرا حاکم اور فرماں روا نہیں ہے اس لئے اطاعت اور فرمانبرداری صرف اسی کی درست ہے۔ انسان نہ تو خود اپنا حاکم بنے اور نہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی حکمرانی کو تسلیم کرے۔ یہی وہ اعلان تھا جس سے ایک طرف تو ان تمام معبودوں کی خدائی ختم ہوتی تھی جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی تھی۔ اور دوسری طرف ہر قسم کی سرداری اور حکومت کے خلاف یہ کھلا ہوا اعلان بغاوت تھا۔ اسی لئے مذہبی پیشوا اور قبائل کے سردار اس اعلان کو برداشت کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے۔

طرف تو مظالم توڑے جارہے تھے لیکن دوسری طرف اسلامی تحریک برابر پھیلتی جارہی تھی۔ مکے میں کوئی خاندان اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس کے کسی نہ کسی شخص نے اسلام قبول نہ کرلیا ہو۔ اور یہی وجہ تھی کہ اسلام کے مخالف اور بھی زیادہ جھنجھلاہٹ اور غصے کا شکار ہوگئے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان کے اپنے بھائی بھتیجے، بہنیں، بہنوئی، بیٹے، بیٹیاں دعوت اسلامی کو قبول کرتے جارہے ہیں اور صرف اسلام کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر الٹا ان سے کٹ جانے کیلئے تیار ہیں۔ ان لوگوں کیلئے یہ چوٹ سخت ناقابل برداشت تھی۔ پھر لطف یہ کہ جو لوگ اس نئی تحریک میں شامل ہورہے تھے وہ ایسے لوگ تھے جو اپنی سوسائٹی میں بہترین لوگ سمجھے جاتے تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ، اخلاق اور عام انسانی خوبیاں سب لوگوں پر واضح تھیں۔ جب اس قسم کے لوگ اسلام قبول کرکے اپنے سارے مفادات پر پانی پھیرنے کیلئے آمادہ ہوجاتے تھے تو بہرحال ہر شخص سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا کہ آخر اس تحریک اور اس کے داعی میں وہ کون سی کشش ہے جو لوگوں کو اس درجہ جاں نثاری پر تیار کردیتی ہے۔ پھر لوگ یہ بھی دیکھتے تھے کہ اسلام کے دائرے میں آجانے کے بعد یہ لوگ اور بھی زیادہ راست باز، سچے بااخلاق، معاملے کے اچھے اور پاکیزہ انسان بن جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جو ہر دیکھنے والے کو مجبور کرتی تھیں کہ وہ چاہے دعوت اسلامی قبول کرے یا نہ کرے لیکن اپنے دل میں اس دعوت کی برتری محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

حبشہ کو ھجرت سن ۵ نبوی:-

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تقریباً ۵ سال ہوچکے تھے جب

آپ نے یہ اندازہ فرمالیا کہ ابھی قریش کے مظالم کے ختم ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو کسی بھی سختی کے مقابلے میں اسلام سے منہ تو نہ موڑیں گے لیکن بہر حال مصائب ان کی قوت برداشت سے باہر ہوتے جارہے ہیں اور ان کے لئے اسلام کے فرائض کا بجالانا تک ناممکن ہوتا جارہا ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ کچھ مسلمان حبشہ کو ہجرت کر جائیں حبشہ افریقہ کے مشرقی ساحل پر ایک ملک تھا جہاں کا بادشاہ ایک نیک دل اور انصاف پسند عیسائی تھا۔ اس ہجرت سے جہاں ایک غرض یہ تھی کہ کچھ مسلمان قریش کے جور وظلم سے کم از کم اس وقت تک نجات پا جائیں جب تک حالات کچھ درست نہ ہو جائیں۔ وہیں ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ ان جاں نثاروں کے ذریعہ اسلام کی دعوت کو کچھ دور دراز علاقوں تک پہنچنے کا موقع ملا۔

چنانچہ پہلی بار گیارہ مرد اور چار عورتیں اس ہجرت کے لئے تیار ہوگئے ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا۔ اللہ کا کرنا کہ جب یہ لوگ بندرگاہ پر آئے تو دو تجارتی جہاز واپسی کے لئے تیار تھے جو ان لوگوں کو بہت ہی سستے کرایہ پر لے گئے۔ قریش کو جب یہ خبر ہوئی تو اُنھوں نے ان لوگوں کا پیچھا کیا۔ لیکن اللہ کے فضل سے ان کا جہاز روانہ ہو چکا تھا۔

حبش میں یہ مسلمان امن وامان سے رہنے لگے لیکن جب یہ خبریں قریش کو پہنچیں تو وہ بڑے تاؤ میں آئے اور آخر کار یہ طے کیا کہ کچھ لوگ حبشہ کے بادشاہ (عرب لوگ اُسے نجاشی کہتے تھے) کے پاس جا کر کہیں کہ یہ لوگ ہمارے مجرم ہیں آپ اُنھیں اپنے ملک سے نکال دیجیے تاکہ ہم انھیں اپنے ساتھ لے

جائیں۔ عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص اس کام کے لئے چنے گئے اور نہایت شان کے ساتھ یہ لوگ حبش روانہ ہوئے۔ پہلے یہ لوگ جا کر حبش کے پادریوں سے ملے اوران سے کہا کہ ان لوگوں نے ایک نیا مذہب نکالا ہے اور جب ہم نے اِنھیں نکال دیا تو یہ بھاگ کر آپ کے ملک میں آگئے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے بادشاہ کے سامنے ہم یہ درخواست پیش کریں کہ یہ ہمارے مجرم ہیں جو بھاگ کر چلے آئے ہیں۔ اِنھیں ہمیں واپس کردیا جائے لٰہذا آپ صاحبان بھی دربار میں ہماری سفارش کریں۔

مسلمان نجاشی کے دربار میں:-

جب مکے والوں کی درخواست نجاشی کے سامنے پیش ہوئی تو اس نے مسلمانوں کو بُلا بھیجا اور پوچھا کہ "یہ تم نے کونسا نیا مذہب ایجاد کیا ہے؟"۔ مسلمانوں نے اپنی طرف سے بات چیت کرنے کے لئے حضرت جعفر بن ابی طالب (حضرت علی کے بھائی) کومقرر کیا۔آپ نے دربار میں اس موقعہ پر جو تقریر فرمائی وہ تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"اے بادشاہ! ہم ایک عرصہ سے جہالت اور گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے ایک خدا کو بھول کر سیکڑوں بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ زنا، لوٹ مار، چوری اور ایک دوسرے پر ظلم کرنا ہمارا رات دن کا کام تھا۔ ہمارا ہر طاقتور اپنے سے کمزور کو کھا جانے پر فخر کرتا تھا غرض کہ ہماری زندگی درندوں اور جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ اللہ کی رحمت دیکھئے کہ اس نے ہمارے حال پر رحم فرمایا۔ ہم میں سے ایک شخص ایسا پیدا ہوا جسے اللہ نے اپنا

رسول بنایا ہم اُس کے نسب سے واقف ہیں۔ وہ نہایت شریف ہے۔ ہم اس کے حالات سے واقف ہیں وہ انتہائی سچا، امانت دار اور پاک دامن ہے۔ دوست اور دشمن سب ہی اس کی نیکی اور شرافت کے قائل ہیں۔ اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں۔ صرف ایک اللہ کو اپنا آقا و مالک تسلیم کریں اور اسی کی بندگی اختیار کریں۔ سچ بولیں، قتل وغارت سے باز آئیں۔ یتیموں کا مال نہ کھائیں۔ پڑوسیوں کی مدد کریں۔ زنا کاری اور دوسری گندی باتوں سے بچیں۔ نماز پڑھیں، روزے رکھیں۔ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کریں۔ ناداروں اور غریبوں کی مدد کریں۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی کو چھوڑ دیا اور تمام برے کاموں سے توبہ کی اس پر ہماری قوم ہماری دشمن ہوگئی اور ہمیں مجبور کرتی رہی کہ ہم پھر پلٹ کر ان ہی کے دین پر آجائیں اور اسی غرض کے لئے اب یہ لوگ آپ سے ہماری واپسی کے لئے اصرار کر رہے ہیں۔''

نجاشی نے کہا ''اچھا تمھارے نبی پر اللہ کا جو کلام اترا ہے اس کا کچھ حصہ پڑھ کر سناؤ۔'' حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی چند آیات پڑھ کر سنائیں۔ نجاشی پر بڑا اثر ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بولا۔ ''خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے قریش کے لوگوں سے صاف کہہ دیا کہ یہ مسلمان آپ کے حوالے نہیں کیے جائیں گے۔

نجاشی کا اسلام:۔

دوسرے دن قریش نے ایک اور چال چلی۔ دربار میں جا کر کہا کہ ذرا ان

مسلمانوں سے یہ تو پوچھئے کہ یہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ مسلمان تو عیسائیوں کے عقیدے کے خلاف حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا کہنے کے بدلے مریم کا بیٹا کہتے ہیں اور جب یہ بات نجاشی کے سامنے آئے گی تو وہ ضرور مسلمانوں سے برگشتہ ہو جائے گا۔ نجاشی نے پھر مسلمانوں کو دربار میں بلا بھیجا جب یہ صورت حال سامنے آئی تو پہلے تو مسلمانوں کو بھی کچھ تردّد ہوا لیکن حضرت جعفرؓ نے کہا۔ ''جو کچھ بھی ہو ہمیں بات سچی ہی کہنا چاہیے۔''

چنانچہ حضرت جعفر نے بھرے دربار میں اعلان فرمایا کہ ''ہمارے پیغمبرؐ نے ہمیں بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بندے اور اس کے پیغمبر تھے۔'' یہ سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھالیا اور کہا: ''خدا کی قسم جو تم نے کہا۔ عیسیٰ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں تھے۔'' اس طرح قریش کا یہ داؤ بھی ناکام ہو گیا۔ نجاشی نے حضرت جعفر اور آپ کے ساتھیوں کو عزت کے ساتھ اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دی اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کر کے اسلام قبول کر لیا اس نجاشی کا نام اصحمہ تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غائبانہ طور پر اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

رفتہ رفتہ تقریباً ۸۳ مسلمان حبشہ کو ہجرت کر گئے۔

حضرت حمزہ کا ایمان:-

مکے میں ایک طرف قریش کے مظالم تھے دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے صبر و استقامت کا مظاہرہ تھا اور اس کشمکش کے

دوران مکے کے بہترین انسان ''کھنچ کھنچ'' کر اسلام کے دائرے میں شامل ہو رہے تھے حضرت حمزہؓ آپ کے چچا تھے۔ لیکن ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین جس بے رحمی کے ساتھ آنحضرتؐ سے پیش آتے تھے اُسے اپنے تو کیا بیگانے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے ایک دن ابوجہل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی گستاخی سے پیش آیا۔ حضرت حمزہ شکار کو گئے ہوئے تھے جب واپس ہوئے تو ایک کنیز نے سارا واقعہ سنایا۔ حضرت حمزہ غصہ سے بیتاب ہو گئے۔ تیر و کمان ہاتھ میں لئے ہوئے حرم میں آئے اور غصے کی حالت میں ابوجہل کو برا بھلا کہا اور کہا۔ ''میں مسلمان ہو گیا ہوں۔''!

حمایت کے جوش میں کہنے کو تو کہہ دیا لیکن ابھی دل باپ دادا کے دین کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا تمام دن سوچتے رہے۔ آخر کار حق کی پکار غالب آئی اور آپ نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ واقعہ سن ۶ نبوی کا ہے۔ اس کے چند دن بعد ہی حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کر لیا۔ دعوت اسلامی کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی بہت ہی اہم ہے۔

حضرت عمرؓ کا اسلام ۶ ؁ نبوی:-

اسلام قبول کرنے سے پہلے حضرت عمر کا شمار ان لوگوں میں تھا جو اسلام کے شدید مخالف تھے۔ ایک طرف تو قریش کے بڑے بڑے لوگ داعئ اسلام اور دعوت اسلامی کی مخالفت میں انتہائی شدت اختیار کرتے جاتے تھے۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت یہ تھی کہ ان کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے آپ کے دل میں انتہائی محبت کے جذبات ابھرتے تھے ابوجہل اور عمر

دونوں آپ کی دشمنی میں بہت سخت تھے لیکن جب دعوت وتبلیغ کی ساری کوششیں ان پر کارگر نہ ہوئیں تو اس رحمت عالم نے ایک بار باری تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ خداوند! ابوجہل اور عمر میں جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہو۔ اس سے اسلام کو معزز فرما'' اس دعا کے چند روز بعد ہی حضرت عمرؓ کو اسلام قبول کرنے کی توفیق ہوئی اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے:۔

خود حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''ایک شب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کرنے کے خیال سے گھر سے نکلا۔ آپؐ مسجد حرام کو جارہے تھے آپؐ بڑھ کر مسجد میں داخل ہو گئے اور نماز شروع کر دی میں سننے کھڑا ہو گیا۔ آپ نے سورہ الحاقہ کی قرأت فرمائی میں اس کلام کو سن کر حیرت میں تھا۔ کلام کا نظم اور انداز نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ خدا کی قسم یہ شاعر ہے ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ آپ نے یہ آیت پڑھی:۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَاهُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ط قَلِيْلاً مَّاتُؤْمِنُوْنَ ٥

ترجمہ :- یہ ایک بزرگ قاصد کا کلام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں، (لیکن) تم ایمان نہیں لاتے۔

میں نے جو یہ سنا تو فوراً دل میں خیال آیا کہ اوہو یہ تو میرے دل کی بات جان گیا۔ یہ کاہن ہے اس کے بعد ہی آپ نے یہ آیت پڑھی۔

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ط قَلِيْلاً مَّاتَذَكَّرُوْنَ ٥ تَنْزِلُ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْن ٥

ترجمہ :- یہ کاہن کا کلام بھی نہیں ہے۔ تم نصیحت نہیں حاصل کرتے۔ یہ تو جہانوں کے رب کی طرف سے اُترا ہے۔

آپؐ نے یہ سورت آخر تک پڑھی اور میں نے محسوس کیا کہ اسلام میرے دل میں گھر کر رہا ہے۔'' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ حضرت عمر ایک مستقل مزاج اور پختہ کار آدمی تھے اس لئے اس موقعہ پر ان میں تغیر پورا نہیں ہوا اور وہ اپنی روش پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن دشمنی کے جوش میں تلوار لے کر اس ارادے سے گھر سے نکلے کہ آج (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہی تمام کردیں راستے میں اتفاق سے نعیم بن عبداللہ سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے پوچھا۔ ''کیوں کدھر جارہے ہو؟'' بولے آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں۔'' اُنھوں نے کہا۔''پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ خود تمھارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔'' یہ سن کر فوراً پلٹے اور سیدھے بہن کے گھر آئے وہ قرآن پڑھ رہی تھیں اُن کو آتا دیکھ کر خاموش ہوگئیں اور قرآن کے اجزاء چھپا لیے لیکن حضرت عمر سن چکے تھے کہ یہ کچھ پڑھ رہی تھیں پوچھا کہ کیا پڑھ رہی تھیں؟ اور یہ کہہ کر تم دونوں باپ دادا کے دین سے خارج ہوگئے ہو اپنے بہنوئی کو مارنے لگے۔ اور جب بہن آڑے آئیں تو ان کی بھی خبر لی یہاں تک کہ دونوں لہولہان ہوگئے۔ لیکن جب ان دونوں نے صاف صاف کہا کہ ہم اسلام قبول کر چکے ہیں اور اب تمھاری کوئی سختی ہمیں اس راستے سے ہٹا نہیں سکتی تو ان کے اس پختہ ارادے کو دیکھ کر حضرت عمر پر کچھ اثر ہوا اور بولے۔ ''اچھا لاؤ مجھے بھی سناؤ تم کیا پڑھ رہی تھیں۔'' آپ کی بہن فاطمہ نے قرآن کے اجزاء لاکر سامنے رکھ دیے وہ سورہ طٰہٰ تھی۔ آپ نے پڑھنا شروع کیا اور جب اس آیت پر پہنچے:۔

اِنَّنِیُ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعُبُدُنِیُ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکُرِیُ

ترجمہ: -میں ہوں خدا، میرے سوا کوئی خدا نہیں تو بندگی میری کرو اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔

تو یہ اثر ہوا کہ فوراً پکار اٹھے۔ ''لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہ'' اور سیدھے آنحضرتؐ کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقم کے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دروازے پر پہنچے تو چونکہ تلوار ہاتھ میں تھی صحابہ کو تردّد ہوا۔ لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''آنے دو اگر اچھی نیت سے آیا ہے تو بہتر ہے ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر اُڑا دوں گا۔'' حضرت عمر نے اندر قدم رکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑھ کر ان کا دامن پکڑا اور فرمایا۔ ''کیوں عمر کس ارادے سے آئے ہو؟'' یہ سنتے ہی حضرت عمر پر ایک رعب طاری ہو گیا اور نہایت عاجزی سے بولے۔ ''ایمان لانے کے لئے۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے ساختہ پکارا ''اللہ اکبر'' اور ساتھ ہی تمام صحابہ نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔

حضرت عمر کے اسلام لانے کے بعد اسلامی جماعت کی قوت میں کافی اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ مسلمان ابھی تک اپنے مذہبی فرائض اعلانیہ ادا نہیں کر سکتے تھے اور کعبے میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تو ممکن ہی نہ تھا۔ حضرت عمر کے اسلام لانے کے بعد حالت بدل گئی اُنھوں نے اعلانیہ اپنے اسلام کا اظہار کیا اگر چہ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ لیکن بالآخر مسلمانوں نے حرم کعبہ میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اور اب ان کی جماعت مقابلتہً

زیادہ قوی جماعت ہوگئی اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی قبولیت اس درجہ ظاہر ہوئی کہ آج چودہ سو برس گذرنے کے بعد بھی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ حضرت عمر کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے اسلام کو جو عزت وسربلندی عطا فرمائی اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ہے۔

شعب ابی طالب میں قید ۷ نبوی:-

اسلامی دعوت کی بڑھتی ہوئی رفتار کو دیکھ کر قریش کے سردار برابر پیچ وتاب کھا رہے تھے اور آئے دن اس تحریک کو دبانے کے لئے نت نئی تدبیریں سوچا کرتے تھے چنانچہ اب اُنھوں نے ایک چال یہ چلی کہ تمام قبیلوں نے مل کر یہ معاہدہ کیا کہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے خاندان بنی ہاشم سے نہ قرابت کرے گا، نہ ان کے ساتھ خرید وفروخت کرے گا، نہ اُن سے ملے گا، اور نہ ان کو کھانے پینے کا کوئی سامان دے گا جب تک وہ خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لئے ہمارے حوالے نہ کر دیں۔ یہ معاہدہ لکھ کر کعبے کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

اب بنی ہاشم کے لئے دو ہی راستے تھے یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے حوالے کردیں یا پھر اس معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کی وجہ سے جو مصیبتیں آئیں اُنھیں جھیلنے کے لئے تیار ہوجائیں چنانچہ ابوطالب مجبور ہوکر تمام خاندان بنی ہاشم کے ساتھ پہاڑ کے ایک درّہ میں مقیم ہوگئے جو موروثی طور پر بنی ہاشم کی ملک تھا۔ اس درّے میں ان لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۳ سال تک بڑی سخت زندگی بسر کرنا پڑی۔ یہاں یہ لوگ بسا اوقات پیڑوں

کے پتے کھا کھا کر وقت گذارتے تھے۔ انتہا یہ کہ لوگ بھوک کی شدت سے سوکھا ہوا چمڑہ تک اُبال کر کھا گئے۔ بچے جب بھوک سے بلکتے تھے تو قریش کے سخت دل ظالم سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ کسی کسی رحم دل کو ترس آ جاتا تو چھپا کر کچھ کھانے کو بھیج دیتا۔

جب مسلسل تین سال تک بنی ہاشم نے استقامت کا ثبوت دیا تو پھر آخر ظالموں کے دل میں ہی اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا فرمایا۔ اور خود ان ہی کی طرف سے معاہدے کے توڑنے کی تحریک شروع ہوئی اور یکے بعد دیگرے لوگوں کے دل نرم ہوتے گئے۔ ابوجہل اور اس کے خیال کے کچھ لوگ تو اڑے رہے لیکن آخر کار ان لوگوں کی زیادہ نہ چل سکی اور تقریباً سن ۱۰ انبوی میں یہ لوگ درّے سے نکال لیے گئے۔

دعوت کی رفتار:-

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ مکی دور کی جدوجہد کی تفصیلات تاریخ اور سیر کی کتابوں میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ چنانچہ اس معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کی درمیانی مدت میں دعوت و تحریک کا کام کس طرح ہوتا رہا اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اس بارے میں بھی کچھ تفصیلات نہیں ملتیں۔ البتہ نزول قرآن برابر ہوتا رہا اور اس دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان کے مضامین اور ہدایات و تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ تحریک کو اس زمانے میں کن کن حالات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔

اس طویل اور شدید کشمکش کے دوران اللہ تعالیٰ نے جو خطبے نازل کیے وہ

انتہائی پُر جوش اور پُر تاثیر ہیں۔ ان میں اہل ایمان کو اُن کے فرائض بتائے گئے اور ان پر کاربند رہنے کی ہدایت کی گئی ان کے شخصی کردار کو اونچے سے اونچے معیار پر لے جانے کی صورتیں بتائی گئیں۔ تقویٰ کی مشق کرنے اور اس صفت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے پر انتہائی زور دیا گیا، اخلاق کی بلندی اور عادات کی اصلاح کے لئے ہدایات دی گئیں جماعتی شعور پیدا کیا گیا اور اجتماعی اخلاق کی تربیت دی گئی۔ دین حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے۔ سخت اور نا گوار حالات میں صبر پر قائم رہنے کی بار بار تاکید کی گئی۔ کامیابی کے وعدے اور جنت کی خوشخبریاں دے کر ان کی ہمت بندھائی گئی۔ دین کی کٹھن راہ میں ثابت قدم رہنے اور ہمت کے ساتھ اللہ کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرنے پر اُبھارا گیا اور ان کے اندر جاں نثاری اور قربانی کا ایسا جوش پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت کو جھیل لینے اور ہر سختی کو برداشت کر لینے کے قابل ہو گئے۔

دوسری طرف مخالفین اور اللہ کے دین سے منہ موڑنے والوں کو ان کے برے انجام سے برابر ڈرایا جا رہا تھا۔ اُنھیں ان قوموں کے عبرت ناک واقعات سنائے جا رہے تھے۔ جنھوں نے ان سے پہلے غفلت اور انکار کی روش اختیار کی اور نتیجے میں ہلاک ہوئے۔ یہ تمام واقعات وہی تھے جن سے عرب والے خود واقف تھے۔ ان کو ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈروں کی طرف توجہ دلائی گئی جن پر سے ہو کر وہ رات دن گزرا کرتے تھے۔ پھر ان کے سامنے توحید اور آخرت کی دلیلیں ان کھلی کھلی نشانیوں سے دی گئیں جو وہ رات دن زمین اور آسمان میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ شرک کی برائیاں واضح کی گئیں۔ خدا

کے مقابلے میں بغاوت کی روش اختیار کرنے کے نتائج سے باخبر کیا گیا۔ آخرت کا انکار کردینے سے زندگی میں جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے اس کو کھول کھول کر سمجھایا گیا۔ باپ دادا کی اندھی تقلید سے انسانیت کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کی نشاندہی کی گئی اور یہ سب باتیں ایسی دلیلوں کے ساتھ بیان کی گئیں جن پر غور کرنے سے بات دل میں اُتر جائے۔

مخالفین اور منکرین جو اعتراضات کرتے تھے ان کے معقول جواب دیے گئے وہ جو شبہات پیش کرتے تھے ان کو دور کیا گیا غرض کہ ان تمام الجھنوں کو صاف کیا گیا جن میں وہ خود گرفتار تھے یا دوسروں کو الجھایا کرتے تھے۔ لیکن اس پوری مدت میں مخالفت اور دشمنی برابر بڑھتی ہی گئی۔

چوتھا دور

مظالم اور مصائب کی انتہا

جب آپ شعب ابی طالب سے باہر آئے اور قریش کے مظالم سے چند دن کے لئے کچھ اماں ملی تو اس کے تھوڑے ہی دن بعد ابوطالب کا انتقال ہوگیا اور کچھ ہی دن بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی رحلت فرمائی۔ اس سال کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غم کا سال فرمایا کرتے تھے۔ ان دونوں ہستیوں کے انتقال کرنے کے بعد قریش کی مخالفت اور ایذا رسانی میں اور بھی شدت ہوگئی اور یہی وہ زمانہ ہے جو تحریکِ اسلامی کے لئے سب سے زیادہ سخت زمانہ تھا اب قریش نے مسلمانوں اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی بے رحمی اور بے باکی سے ستانا شروع کردیا۔

مکے سے باہر تبلیغ:-

مکے والوں میں سے جو بہترین آدمی تھے وہ تقریباً سب چھٹ چھٹ کر اسلامی جماعت میں آچکے تھے۔ چنانچہ اب داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے سے باہر جا کر اللہ کا پیغام پہنچانے کا فیصلہ فرمایا۔ اسی پروگرام کے تحت آپ طائف بھی تشریف لے گئے۔ طائف میں بڑے بڑے امراء اور بااثر لوگ رہتے تھے۔ آپ اسلام کی دعوت لے کر ان لوگوں کے پاس بھی تشریف لے گئے لیکن جیسا کہ دولت اور اقتدار اکثر قبول حق کی راہ میں رکاوٹ ہی رہا ہے، یہاں بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ ایک سردار نے کہا۔ ''کیا خدا کو تیرے سوا کوئی ملا ہی نہیں جو اُسے اپنا رسول بناتا۔'' دوسرے صاحب بولے۔ ''میں تو تجھ سے بات نہیں کرسکتا۔ اگر تو سچا ہے تو تجھ سے بات کرنا خلافِ ادب ہے اور اگر جھوٹا ہے (نعوذ باللہ) تو منہ لگانے کے قابل نہیں۔'' غرض ان ''بڑوں'' نے بات یوں ہی پھبتیوں میں اُڑادی اور اتنا ہی نہیں بلکہ شہر کے غنڈوں اور بدمعاشوں کو ابھار دیا جنھوں نے سر بازار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا اور پتھر مارے اس موقعہ پر آپ اتنے زخمی ہو گئے کہ جسم مبارک سے جو خون بہا تو جوتوں میں بھر گیا۔ مگر ظالم برابر پتھر مارتے اور گالیاں دیتے رہے یہاں تک کہ آپؐ نے ایک باغ میں جا کر پناہ لی۔

کسی مخالف شہر میں اس طرح تنہا جا کر تبلیغ کا فرض ادا کرنا اور جان جوکھم میں ڈال کر اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا کس درجہ ہمت اور جرأت کا کام ہے اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور اس پر انتہائی

توکل کی ایک بلند ترین مثال ہے۔ اور بعد کے آنے والوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ (اُسوہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ حج کے زمانے میں جب تمام ملک سے مختلف قبائل مکے میں آتے تو آپ ایک قبیلے کے پاس جاتے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ اسی طرح عرب میں جن مقامات پر میلے لگتے تھے آپ وہاں بھی تشریف لے جاتے تھے اور ان مجمعوں سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش فرماتے تھے۔ ایسے موقعوں پر اکثر قریش کے سردار (خصوصاً ابولہب) بھی ساتھ ہو لیتے اور جس مجمع میں آپ تقریر فرماتے، وہ لوگوں سے کہتے ''دیکھو اس کی بات نہ سننا، یہ دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے موقعوں پر قرآن پاک کے کچھ حصے سناتے جو اپنے اثر کے لحاظ سے تیر بہدف ثابت ہوتے۔ ان کو سن کر اکثر لوگوں کے دلوں میں اسلام گھر کر لیتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تبلیغی دورے اپنے نتائج اور اثر کے لحاظ سے انتہائی کامیاب رہے اور اب اسلام کی دعوت عرب میں اجنبی نہیں رہ گئی بلکہ دور دور دعوت کا تعارف ہو گیا۔ جو لوگ فیصلہ کر کے اسلامی تحریک کے ساتھی بن گئے تھے اُنھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں تبلیغ و دعوت کا کام شروع کر دیا تھا۔

لیلۃ الجن:-

اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات میں سے جن بھی ایک مخلوق ہے جن بھی انسانوں کی طرح ارادہ اور اختیار کے مالک ہیں اور اسی بنیاد پر وہ بھی خدا کی بھیجی

ہوئی ہدایت کے مکلّف ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرنا، ان کے لئے بھی ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر ان میں بھی اچھے اور برے لوگ ہوتے ہیں۔

جنوں کے وجود کے بارے میں قدیم زمانے سے لوگوں میں قسم قسم کے خیالات موجود رہے ہیں۔ عرب میں بھی جنّات کا بڑا چرچا تھا۔ ان کی پوجا ہوتی تھی۔ ان سے مدد مانگی جاتی تھی۔ عامل لوگ ان سے دوستی کا دعویٰ کرتے تھے اور قسم قسم کے افسانے ان کے بارے میں مشہور تھے۔ غرض یہ کہ جس طرح اور ہزاروں دیویاں اور دیوتا خدائی میں شریک مانے جاتے تھے اسی طرح جنّات کو بھی خدائی میں شریک مانا جاتا تھا اسلام نے ان تمام عقائد کی اصلاح کی۔ اس نے بتایا کہ جن اللہ کی ایک مخلوق ضرور ہیں لیکن ان کو کسی طرح بھی خدائی میں دخل نہیں۔ نہ وہ اپنے اختیار سے کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ ان پر بھی اللہ کی بندگی فرض ہے۔ ان میں بھی خدا کے فرماں بردار اور نافرمان ہوتے ہیں اور وہ بھی انسانوں کی طرح اپنے اچھے اور برے اعمال کی جزا یا سزا پائیں گے۔ خدا کی قدرت کے مقابلے میں انسان کی طرح جن بھی مجبور اور لاچار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا دین جو اَب اپنی آخری شکل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو مل رہا تھا اس کی پیروی جس طرح انسانوں کے لئے ضروری تھی اسی طرح جنوں کے لئے بھی ضروری تھی چنانچہ ایک بار جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تبلیغی دورے پر عرب کے ایک مشہور میلے عکاظ تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں ایک رات نخلہ کے مقام پر قیام ہوا۔ صبح کے وقت آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند صحابہ کے ساتھ نماز میں مصروف تھے اور قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ اتفاق سے جنوں کی ایک جماعت اُدھر سے گذری۔ اُنھوں نے قرآن سنا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن پاک میں سورۂ الاحقاف میں اس طرح ہے:-

''ہم نے جب جنوں کی ایک جماعت کے رخ کو اے پیغمبر! تیری طرف پھیر دیا کہ وہ قرآن سنیں۔ تو جب وہ آئے تو اُنھوں نے ایک دوسرے سے کہا۔ ''خاموش رہو۔'' اور جب قرآن ختم ہوگیا تو اُنھوں نے جا کر اپنی قوم کو متنبہ کیا۔ اُنھوں نے کہا۔ ''بھائیو! ہم نے ایک کتاب کو سنا۔ جو موسیٰؑ کے بعد اُتاری گئی ہے اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں یہ ان کی تصدیق کرتی ہے، حق کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور سیدھی راہ دکھاتی ہے۔ بھائیو! اللہ کی طرف پکارنے والے کی بات مانو اور اس پر ایمان لاؤ تا کہ اللہ تمھارے گناہوں کو معاف فرمائے اور تم کو دردناک عذاب سے پناہ دے۔''

اس واقعہ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ ہوا اور اس کی تفصیلات سورۂ جن میں مذکور ہیں۔

مدینے میں اسلام ۱۰ سنہ نبوی:-

اسلام کی آواز جس طرح دور دور عرب کے دوسرے علاقوں میں پہنچ رہی تھی اسی طرح مدینے میں بھی پہنچی۔ مدینے میں بہت قدیم زمانے سے یہودی بھی آ کر آباد ہوگئے تھے اُنھوں نے مدینے کے قریب اپنے چھوٹے چھوٹے قلعے بنالیے تھے۔

اوس اور خزرج دو بھائی تھے جن کا اصل وطن تو یمن تھا لیکن وہ کسی زمانے میں یمن سے آ کر مدینے میں آباد ہو گئے تھے۔ ان ہی کی نسل سے وہاں دو بڑے بڑے خاندان ہو گئے تھے جو اوس اور خزرج کہلاتے تھے۔ یہی لوگ آگے چل کر انصار کے لقب سے پکارے گئے ان لوگوں نے بھی مدینہ اور اس کے اردگرد کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا رکھے تھے۔ یہ لوگ اعتقاداً بت پرست تھے۔ لیکن یہودیوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے رسالت، وحی، کتب آسمانی اور آخرت کے عقیدوں سے آشنا ضرور تھے۔ چونکہ ان کے اپنے پاس کوئی چیز ایسی تھی نہیں اس لئے مذہب کے معاملے میں یہ لوگ یہودیوں سے کچھ مرعوب بھی تھے اور ان کی باتوں کو وزن دیتے تھے ان لوگوں نے یہودی علماء سے یہ بھی سنا تھا کہ دنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والے ہیں جو کوئی ان کا ساتھ دے گا وہی کامیاب ہوگا اور یہ کہ اس پیغمبر کا ساتھ دینے والے ہی ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ یہی معلومات تھیں جن کی بناء پر مدینہ والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ حج کے زمانے میں آپ قبیلوں کے سرداروں کے پاس تشریف لے جاتے اور اُنھیں دعوتِ اسلامی سے روشناس کراتے۔ ۱۰ ؁ نبوی کا ذکر ہے کہ آپ نے مقام عقبہ کے پاس خاندان خزرج کے چند لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن مجید کی کچھ آیتیں سنائیں۔ یہ کلام سن کر ان کے دلوں پر اثر ہوا اور وہ سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہی وہ نبی ہیں جن کے بارے میں یہودی علماء کہتے ہیں کہ اللہ کے ایک اور نبی تشریف لانے والے

ہیں۔ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا۔"کہیں ایسا نہ ہو کہ اس نبی پر ایمان لانے میں یہودی ہم سے اولیت میں بازی لے جائیں۔" یہ کہہ کر ان لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ چھ آدمی تھے۔اس طرح مدینہ کے انصار میں اسلام کی ابتداء ہوئی اور وہ بستی جو آئندہ اسلامی تحریک کا مرکز بننے والی تھی اس میں اسلام کی روشنی کی ابتداء ہوگئی۔

مخالفت میں شدت:-

ہر تحریک کی توسیع کے ساتھ ساتھ مخالفت اور کشمکش بھی بڑھتی ہے لیکن اسلامی تحریک کی توسیع اپنے ساتھ مخالفت اور کشمکش کا جو طوفان لاتی ہے وہ اس کے علم برداروں کے لئے بہت سخت امتحان ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو دعوت اسلامی کا تعارف بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف داعئ حق اور اس کے ساتھیوں کو سخت سے سخت حالات سے گزرنا پڑ رہا تھا۔قریش کے سرداروں نے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا ستائیں کہ بالآخر مجبور ہو کر وہ اسلام کی دعوت سے ہاتھ اٹھالیں۔قریش کے بڑے بڑے سردار آپ کے ہمسایہ تھے اور یہی آپ کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھاتے،نماز پڑھتے وقت ہنسی اُڑاتے۔آپ سجدے میں ہوتے تو وہ اوجھڑی لاکر گردن پر ڈال دیتے۔ گلے میں چادر لپیٹ کر ایسی بے دردی سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں۔لڑکوں کو پیچھے لگا دیتے جو گالیاں دیتے اور تالیاں پیٹتے۔آپ کہیں کوئی وعظ فرماتے تو درمیان میں گڑبڑ کرتے اور کہتے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔غرض یہ کہ ستانے اور پریشان کرنے کی

جتنی مکروہ سے مکروہ صورتیں ممکن تھیں وہ سب کرتے۔

اس دور میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر جو کچھ وحی فرمارہا تھا۔ اس میں ان تمام حالات سے نمٹنے کے لئے سامان ہدایت موجود تھا۔ تحریک اسلامی کے علم برداروں کو بتایا جارہا تھا کہ اس وقت بظاہر حق جس مظلومیت کا شکار ہورہا ہے اُسے کوئی مستقل چیز نہ سمجھنا چاہیے۔ دنیا کی زندگی میں اس طرح کے تماشے ہوتے ہی آئے ہیں اور یوں بھی کامیابی کا اصل معیار دنیا کی زندگی نہیں بلکہ آخرت کی زندگی ہے اور یہ طے ہے کہ آخرت ان ہی لوگوں کے لئے بہتر ہوگی جوتقویٰ کی زندگی اختیار کریں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا جاتا تھا کہ۔ ''اگر چہ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہورہا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ ہے لیکن دراصل یہ لوگ جو حق کو جھٹلا رہے ہیں وہ تمھیں نہیں بلکہ ہمیں جھٹلا رہے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ معاملہ کچھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے لیکن ان رسولوں نے ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کیا اور ہر قسم کی مصیبتوں اور تکلیفوں کو جھیلا یہاں تک کہ اُنھیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ تم بھی ایسے ہی حالات سے گذر رہے ہو اور ایسے حالات سے گذرنا ہی پڑے گا۔'' اُنھیں بار بار مختلف انداز سے سمجھایا جارہا تھا کہ حق اور باطل کی کشمکش کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایک مقررہ قانون ہے جس کو بدل ڈالنا کسی کے بس کی بات نہیں اس قانون کی رو سے یہ لازمی ہے کہ حق پرستوں کو ایک طویل مدت تک آزمایا جائے ان کے صبر، راست بازی، ایثار، وفاداری، فداکاری اور ایمان کی پختگی کا امتحان لیا جائے اور یہ

اندازہ کیا جائے کہ وہ توکل علی اللہ اور ایمان باللہ میں کہاں تک مضبوط ہیں اس کشمکش کے دوران ان کے اندر وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جو انھیں آگے چل کر اللہ کے دین کا علم بردار بننے میں مدد دیتی ہیں۔ جب یہ لوگ اس امتحان میں اپنے کو اہل ثابت کر دیتے ہیں تو پھر اللہ کی مدد ٹھیک اپنے وقت پر آتی ہے اس سے پہلے وہ کسی کے لائے نہیں آسکتی۔

بیعت عقبہ اولیٰ ١١ھ نبوی:-

دوسرے سال مدینے کے بارہ آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس بات کی خواہش کی کہ اسلام کی تعلیم کے لئے کوئی صاحب ان کے ساتھ بھیج دیے جائیں۔ چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ مدینہ بھیج دیا گیا۔ یہ مدینہ میں ایک ایک گھر کا دورہ کرتے۔ لوگوں کو قرآن مجید پڑھ کر سناتے اسلام کی دعوت دیتے اور اس طرح روزانہ ایک دو آدمی اسلام قبول کر لیتے۔ رفتہ رفتہ اسلام مدینے سے باہر بھی پھیلنے لگا۔ قبیلہ اوس کے سردار حضرت بن معاذ نے بھی حضرت مصعب کے ہاتھ پر ہی اسلام قبول کیا۔ ان کا اسلام قبول کرنا گویا قبیلہ اوس کا اسلام قبول کر لینا تھا۔

بیعت عقبہ ثانیہ ١٢ھ نبوی:-

اگلے سال بہتر (٧٢) آدمی حج کے زمانے میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے چھپ کر عقبہ کے مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ہر قسم کے نرم اور گرم حالات میں اسلامی تحریک کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گروہ میں سے بارہ اشخاص منتخب فرما کر اُنھیں نقیب (سردار) مقرر کیا ان میں سے نو قبیلہ خزاج میں سے اور تین قبیلہ اوس میں سے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے جن باتوں کا اقرار لیا وہ یہ تھیں:۔

☆ سوائے ایک خدا کے کسی دوسرے کی بندگی نہیں کریں گے۔

☆ چوری نہیں کریں گے۔

☆ زنا نہیں کریں گے۔

☆ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔

☆ کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے۔

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جس اچھی بات (معروف) کا حکم دیں گے وہ اس سے منہ نہ موڑیں گے۔

بیعت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ان شرائط کو پورا کرو گے تو تمھارے لیے جنت کی خوشخبری ہے۔ نہیں تو تمھارا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے چاہے تم کو معاف فرمادے اور چاہے تو تمھیں عذاب دے۔

جب یہ لوگ بیعت کر رہے تھے تو اسعد بن زرارہؓ نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''بھائیو! یہ بھی جانتے ہو کہ تم کس بات پر بیعت کر رہے ہو، سمجھ لو، یہ عرب اور عجم کے خلاف اعلان جنگ ہے۔''

سب نے کہا کہ ہاں ہم یہ سب کچھ سمجھ کر بیعت کر رہے ہیں۔ اہل وفد میں سے کچھ اور لوگوں نے بھی اسی قسم کی پر جوش تقریریں کیں اور اسی موقعہ پر مدینہ

کے ان نومسلموں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ قول وقرار ہوا کہ اگر آنحضرت کسی وقت مدینہ تشریف لے آئیں تو مدینہ کے لوگ ہر عنوان مرتے دم تک ان کا ساتھ دیں گے۔ اسی موقع پر حضرت براءؓ نے کہا تھا کہ۔ ''ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں۔''

++

چھٹا باب

معجزات اور معراج

دین کی اصطلاح میں معجزہ اس بات کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کسی پیغمبرؑ کے دعوئے نبوت کو ثابت کرنے کیلئے دنیا والوں کے سامنے ظاہر فرمائے۔ اس کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ عام عادت کے خلاف ہو۔ مثلاً آگ کا کام جلانا ہے لیکن وہ نہ جلائے۔ سمندر بہتا ہے لیکن وہ تھم جائے درخت ایک جگہ قائم رہتا ہے لیکن وہ چلنے لگے۔ مردہ جی اُٹھے۔ یا لکڑی سانپ بن جائے وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ دنیا میں ہر فعل کی اصل علت اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا ارادہ ہے اس لئے جس طرح کچھ کام مقررہ اصولوں کے ماتحت مسلسل ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ماتحت کچھ کام ان عادی اصولوں سے ہٹ کر کچھ دوسرے غیر عادی اصولوں کے ماتحت بھی ہو سکتے ہیں اور جب اللہ چاہتا ہے، ہو جایا کرتے ہیں۔

اکثر انبیاء علیہم السلام کو اُن کی نبوت کے ثبوت کیلئے معجزے عطا کیے گئے تھے۔ لیکن یہ معجزات کافروں کیلئے ایمان لانے اور یقین کرنے کا سبب کم ہی ہوئے ہیں۔ معجزات کا ظہور ایک قسم کا اتمامِ حجت ہوتا ہے۔ اسی لئے جب لوگوں نے معجزے دیکھنے کے بعد بھی نبی کا انکار ہی کیا تو ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا ہے اور اُنھیں دنیا سے مٹا دیا گیا ہے۔ قریش کے کفار بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزے طلب کرتے تھے۔ اُن کی یہ طلب برابر ٹالی جا رہی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا

طریقہ یہی رہا ہے کہ اگر لوگوں کے سامنے اُن کی طلب کے جواب میں کوئی واضح معجزہ دکھا دیا جائے تو پھر اُن کیلئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ ایمان یا ہلاکت۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ابھی ان لوگوں کو ہلاک کرنے کا نہیں تھا۔ اس لئے اُن کا یہ مطالبہ برابر ٹالا جا رہا تھا۔ لیکن اب جب کہ تقریباً دس گیارہ سال مسلسل دعوت دیتے ہوئے گذر چکے تھے اور قوم کو سمجھانے کی حد ہو گئی تھی تو بسا اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مومنین کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی نشانی اللہ کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جاتی جسے دیکھ کر یہ لوگ ایمان لے آتے اور اسلام کی سچائی کے قائل ہو جاتے، لیکن آپ کی اس خواہش کے جواب میں یہی کہا جا رہا تھا کہ دیکھو بے صبری سے کام نہ لو جس ترتیب اور جس ڈھنگ سے دعوت کا کام ہم چلوا رہے ہیں، اُسے اسی طریقے سے صبر کے ساتھ انجام دیتے رہو۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو یہ کام کبھی کا ہو چکا ہوتا۔ ہم چاہتے تو ایک ایک کافر کے دل کو موم کر دیتے اور اس کو زبردستی ہدایت کے راستے پر چلا دیتے، لیکن یہ ہمارا طریقہ نہیں ہے۔ اس طرح نہ تو انسان کے ارادہ اور اختیار کا امتحان ہوتا ہے اور نہ وہ فکری اور اخلاقی انقلاب آتا ہے جس کی بنیاد پر ایک کامیاب معاشرہ بنا کرتا ہے۔ تاہم اگر لوگوں کی بے پروائی اور اُن کے انکار کی وجہ سے تم حالات کا مقابلہ صبر کے ساتھ نہیں کر سکتے تو جو تمھارا بس چلے وہ کرلو۔ زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر کوئی معجزہ لے آؤ[1]۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزات عطا نہیں ہوئے۔ آپ کا سب سے بڑا معجزہ تو خود قرآن مجید ہے جس کے بارے

---

[1] سورۃ انعام آیت ۳۵

میں تفصیل آئندہ صفحات میں اپنے موقعہ پر آئے گی۔ اس کے علاوہ مناسب موقعوں پر آپؐ کی ذات سے بے شمار معجزات کا ظہور ہوا ہے۔ ان میں سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا (شق القمر) اور آپؐ کا آسمانوں کی سیر کے لئے تشریف لے جانا (معراج) بہت اہم ہیں، ان کے علاوہ بہت سی پیشن گوئیاں، آپ کی دعا سے پانی کا برسنا، لوگوں کا ہدایت یاب ہونا۔ ضرورت کے وقت تھوڑی سی چیز کا بہت ہو جانا، مریضوں کا اچھا ہو جانا۔ پانی جاری ہو جانا، وغیرہ وغیرہ بے شمار معجزات ہیں جن کا ظہور اپنے اپنے وقت پر ہوا ہے۔

شق القمر:-

کفار مکہ پر اتمام حجت کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا ایک بہت اہم معجزہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہٗ نے اس واقعہ کی روایت کی ہے جو صحیح بخاری اور مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔ وہ اس واقعہ کے وقت موجود تھے۔ اور اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا وہ فرماتے ہیں۔ ''ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی طرف چلا گیا۔ آپؐ نے فرمایا'' گواہ رہو۔'' لیکن جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ معجزہ دیکھنے کے بعد کفار ایمان لے ہی آئیں۔ بلکہ ہوتا یہی ہے کہ معجزے وہی لوگ طلب کرتے ہیں جن کے دلوں میں انکار اور ہٹ دھرمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور اس طرح وہ اپنے انکار کے لئے حیلے بہانے تلاش کرتے ہیں، جن کے دلوں میں ایمان قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے

اور جو اغراض اور مادی مفادات کے پھندوں میں جکڑے ہوئے نہیں ہوتے اُن کو تو رسولؐ کی ذات اور اس کی تعلیمات ہی سب سے بڑھ کر معجزہ دکھائی دیتی ہیں اور وہ حق کے قبول کرنے میں ہمیشہ پیش قدمی کرتے ہیں، چنانچہ چاند کے پھٹ جانے کے بعد بھی کفار نے یہی کہا کہ ''ارے یہ تو جادو ہے اور جادو کے زور سے ایسے کام ہوتے ہی آئے ہیں۔'' اس طرح اُن لوگوں کو ہدایت تو نہ ہوئی البتہ اُن کے جرموں کی فہرست میں ایک اہم جرم یہ اور بڑھ گیا کہ اُنھوں نے ایسی کھلی ہوئی نشانی کے بعد بھی اللہ کے رسول کو جھوٹا سمجھا۔

معراج:-

معراج کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک آسمانی سفر کے بارے میں یہ لفظ استعمال فرمایا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو جو آپ نے آسمانوں کا کیا، معراج کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام اسراء بھی ہے۔ اسراء راتوں رات سفر کرنے کو کہتے ہیں، چونکہ یہ سفر راتوں رات ہوا تھا اس لئے اسے اسراء بھی کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو دعوت و تبلیغ اور اِقامت دین کی جو خدمات انجام دینا ہوتی ہیں اُن کے لئے جس درجہ پختہ ایمان اور یقین کی ضرورت ہے اُس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ جن اَن دیکھی حقیقتوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں اُنھیں وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ کیونکہ اُنھیں دنیا کے سامنے پوری قوت اور زور سے یہ بات کہنا ہوتی ہے کہ تم محض گمان اور قیاس پر ایک چیز کا

انکار کررہے ہو۔ حالانکہ ہم آنکھوں دیکھی حقیقت بیان کررہے ہیں۔ تمہارے
پاس گمان ہے اور ہمارے پاس علم، اسی لئے اکثر انبیاء علیہم السلام کے سامنے
فرشتے ظاہر ہوئے ہیں۔ اُن کو آسمان اور زمین کی حکومت کا مشاہدہ کرایا گیا
ہے۔ دوزخ اور جنت اُن کو آنکھوں سے دکھائی گئی ہے اور مرنے کے بعد انسان
پر جو حالات گزرتے ہیں وہ اُن کی اسی زندگی میں دکھادیے گئے ہیں، معراج یا
اسراء بھی اسی قسم کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کو وہ حقیقتیں دکھادی گئیں۔ جن پر ایک مومن بلا دیکھے رسول کے فرمانے
پر ایمان لاتا ہے۔

معراج کا واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا، اس بارے میں تو روایات مختلف ہیں۔
البتہ تمام روایات کو سامنے رکھنے کے بعد تاریخ لکھنے والوں نے جس بات کو ترجیح
دی ہے وہ یہ ہے کہ واقعہ ہجرت سے تقریباً سال ڈیڑھ سال پہلے کا ہے۔ اس
واقعہ کے بارے میں امام بخاری اور مسلم کی روایات کو سامنے رکھنے کے بعد جو
مجموعی تفصیل سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صبح کو ارشاد فرمایا کہ گذشتہ رات میرے
رب نے مجھے بڑی عزت بخشی۔ میں سورہا تھا کہ جبریلؑ نے آکر مجھے جگایا اور
مجھے حرم کعبہ میں اٹھالائے۔ یہاں لاکر اُنھوں نے میرا سینہ چاک کیا اور اُسے
زم زم کے پانی سے دھویا (زم زم کعبہ میں ایک متبرک کنواں ہے) پھر اُسے
ایمان اور حکمت سے بھر کر بند کردیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے میری سواری کے
لئے ایک جانور پیش کیا۔ جو خچر سے کچھ چھوٹا اور سفید رنگ کا تھا۔ اُس کا نام

براق تھا۔ یہ بہت تیز رفتار تھا۔ میں اس پر سوار ہوا ہی تھا کہ اچانک ہم بیت المقدس جا پہنچے یہاں براق مسجد کے دروازے پر باندھ دیا گیا اور میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا۔ دو رکعت نماز پڑھی۔ اَب جبریلؑ نے میرے سامنے دو پیالے پیش کیے، ایک شراب اور دوسرا دودھ سے بھرا ہوا تھا، میں نے دودھ کا پیالہ قبول کرلیا اور شراب کا واپس کردیا۔ جبریل نے یہ دیکھ کر کہا کہ آپؐ نے دودھ کا پیالہ قبول کرکے دینِ فطرت کو اختیار کیا۔

اس کے بعد آسمان کا سفر شروع ہوا۔ جب ہم پہلے آسمان (آسمانِ دنیا) تک پہنچے تو جبریلؑ نے نگہبان فرشتے سے دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ اُس نے پوچھا تمھارے ساتھ کون ہیں؟ جبریلؑ نے بتایا یہ محمد ہیں۔" فرشتے نے پھر پوچھا۔ "کیا یہ بلائے گئے ہیں؟" جبریلؑ نے کہا۔ "ہاں بلائے گئے ہیں۔" یہ سن کر فرشتہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ایسی ہستی کا آنا مبارک ہو۔" جب ہم اندر داخل ہوئے تو حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ جبریلؑ نے مجھ سے کہا۔ "یہ آپ کے والد (نسلِ انسانی کے مؤرث اعلیٰ) آدمؑ ہیں۔ آپ ان کو سلام کیجیے۔ میں نے سلام کیا۔ اُنھوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ "خوش آمدید" اے صالح بیٹے! اور اے صالح نبی!" اس کے بعد دوسرے آسمان تک پہنچے اور پہلے آسمان کی طرح جواب وسوال کے بعد دروازہ کھلا اور ہم اندر گئے تو وہاں یحیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) سے ملاقات ہوئی۔ جبریلؑ نے اُن سے تعارف کرایا۔ اور کہا۔ "آپ سلام کیجیے۔" میں نے سلام کیا۔ دونوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ "خوش آمدید، اے صالح بھائی اور

اے صالح نبی۔'' پھر تیسرے آسمان تک اسی طرح پہنچے یہاں حضرت یوسف (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی اور پہلے کی طرح سلام وجواب ہوا۔ چوتھے آسمان پر حضرت ادریس (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی۔ پانچویں پر حضرت ہارون (علیہ السلام) اور چھٹے پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ملے۔ ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے بھی سلام کے جواب میں فرمایا۔ ''خوش آمدید اے صالح بیٹے اور صالح نبی۔'' پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا۔ یہ ایک بیری کا پیڑ ہے انتہا پر، اس پر بے شمار ملائکہ جگنو کی طرح چمک رہے تھے۔

یہاں آپؐ نے بہت سی حقیقتوں کا مشاہدہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام بھی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے رات دن میں پچاس وقت کی نمازیں آپ کی اُمت کے لئے فرض کیں۔ جب آپ ان مشاہدات سے فارغ ہوکر واپس ہوئے تو پھر حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے پوچھا کہو، بارگاہِ خداوندی سے کیا تحفہ لائے؟'' فرمایا۔ ''دن رات میں پچاس (۵۰) نمازیں۔'' اُنھوں نے فرمایا۔ ''آپ کی اُمت اس بار کو نہ اٹھا سکے گی۔ اس لئے واپس جایئے اور اِنھیں کم کرایئے۔'' چنانچہ آنحضرتؐ واپس تشریف لے گئے اور کمی کی درخواست کی۔ وہاں سے ایک حصہ کم کر دیا گیا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے آپ کو بار بار بھیجا اور بار بار کمی کرائی۔ آخر میں یہ تعداد گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئی۔ اس پر بھی اگر چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن نہیں تھے اور مزید کمی کرانے کو کہتے تھے لیکن اَب آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مجھے مزید کچھ کہتے شرم آتی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ

کی طرف سے ندا آئی کہ اگر چہ ہم نے نمازوں کی تعداد پچاس سے گھٹا کر پانچ کر دی لیکن تمھاری اُمت میں جو لوگ پابندی سے روزانہ پانچ وقت کی نماز ادا کریں گے اُنھیں اجر پچاس نمازوں کا ہی دیا جائے گا۔

نماز کے علاوہ اس موقع پر بارگاہِ الٰہی سے دو تحفے اور بھی مرحمت ہوئے ایک تو سورہ بقرہ کی آخری آیتیں جن میں اسلام کے عقائد اور ایمان کی تکمیل کا بیان ہے اور یہ بشارت ہے کہ اب مصیبتوں کا دور ختم ہونے والا ہے۔ دوسری یہ خوشخبری کہ اُمت محمدیؐ میں سے جو کوئی شرک سے بچا رہے گا اس کی مغفرت ہو جائے گی۔

اس سفر میں آپ نے جنت اور دوزخ کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مرنے کے بعد اعمال کے لحاظ سے جس جس قسم کے حالات سے لوگوں کو گذرنا ہوتا ہے اس کے بھی چند مناظر آپ کے سامنے پیش کیے گئے۔

آسمانوں سے واپس ہونے کے بعد جب آپ پھر بیت المقدس تشریف لائے تو دیکھا یہاں انبیاء علیہم السلام کا مجمع ہے۔ آپؐ نے نماز پڑھائی اور سب نے آپؐ کے پیچھے نماز ادا کی۔ اس کے بعد آپ اپنے مقام پر واپس تشریف لے آئے اور صبح کو اُسی مقام سے بیدار ہوئے۔

معراج کی اہمیت اور آئندہ کے لئے اشارے:-

صبح کو جب آپؐ نے یہ واقعہ بیان فرمایا تو کفار قریش میں جو لوگ مخالف تھے۔ اُنھوں نے آپؐ کو جھوٹا کہا (نعوذ باللہ) اور جن لوگوں کے دلوں میں آپ کی سچائی اور صداقت کا یقین تھا۔ اُنھوں نے حرف حرف کی تصدیق کی اور کہا کہ

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تو یہ سب واقعات درست ہی ہیں۔ اس طرح معراج کا یہ واقعہ ایک طرف تو لوگوں کے ایمان اور رسالت کی تصدیق کا امتحان تھا۔ دوسری طرف خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی بے شمار حقیقتوں کے مشاہدے کا ذریعہ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اُس آنے والے انقلاب کے لئے ایک اشارہ تھا جس سے اسلامی تحریک کو جلد ہی دوچار ہونا تھا۔ اس اشارے کی تفصیلات قرآن پاک کی سورۂ بنی اسرائیل میں ملتی ہیں جس میں معراج کا بیان ہے۔ اس سورت کے مضامین میں جو کھلے کھلے اشارے ملتے ہیں وہ یہ ہیں:-

یہود کی معزولی:-

بنی اسرائیل اب تک اللہ کے دین کے وارث تھے اور اس خدمت پر مامور کہ وہ دنیا کو خدائی پیغام (اسلام) سے روشناس کرائیں لیکن اُنھوں نے اس خدمت کو انجام نہیں دیا بلکہ خود بے شمار برائیوں کا شکار ہو گئے اور اس قابل نہ رہے کہ اللہ کے دین کی خدمت بجالا سکیں۔ لہٰذا اب یہ خدمت بنی اسماعیل کو سپرد کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خاندان میں مبعوث کیا گیا۔ اب تک بنی اسرائیل سے براہِ راست خطاب نہیں کیا گیا تھا۔ اب سورۂ بنی اسرائیل میں اُن سے کہا گیا کہ اب تک جو غلطیاں تم کر چکے سو کر چکے تم کو اب سے پہلے دو بار آزمایا جا چکا ہے لیکن تم نے اپنی حالت کو ٹھیک نہیں کیا۔ اب اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے بعد پھر تمھیں موقع مل رہا ہے۔ اگر تم اُن کی پیروی کرو گے تو پھر ترقی کی راہ پر قدم بڑھا سکو گے۔ مکے

کی انتہائی مظلومانہ اور پریشانی سے بھری ہوئی زندگی میں یہ اشارہ ایک بہت بڑی بشارت تھی جو آگے چل کر بالکل ٹھیک ثابت ہوئی۔

کفار مکہ کو تنبیہ:-

کفار مکہ کے مظالم اور اُن کی ہٹ دھرمی کی انتہا ہو چکی تھی اور وہ بار بار کہتے تھے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو ہمارے انکار کرنے پر ہم پر وہ عذاب کیوں نہیں آتا جس سے یہ ہمیں ڈراتے ہیں۔ اس کے جواب میں اُنھیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ جب تک کسی قوم میں اللہ کا رسول نہ آئے اس وقت تک اس پر عذاب نہیں آتا۔ جب اللہ کا رسول آتا ہے تو قوم کے دولت منداور اونچے طبقے کے لوگ اس کی دعوت حق کی جڑ کاٹنے کے لئے کمر باندھ لیتے ہیں اور قوم کے عام لوگ اُن کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ سوائے کچھ ایسے لوگوں کے جن میں حق کے قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو آگے بڑھ کر حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس وقت ان دونوں گروہوں میں کش مکش شروع ہو جاتی ہے اور پھر اللہ کی مدد آتی ہے۔ اس مدد کا ایک وقت معین ہوتا ہے۔ البتہ انسان چونکہ جلد باز واقع ہوا ہے، اس لئے وہ کبھی ایسی چیز کو بھی خیر سمجھ کر طلب کرنے لگتا ہے جو دراصل اس کے لئے خیر نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے شر ہوتی ہے اور اُسے یہ دھیان نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کے سارے کام اپنے اپنے اوقات کے اعتبار سے بدلے ہوئے ہیں۔ دن اور رات کو ہی دیکھو۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اور ایک لگے بندھے نظام کے تحت یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ پچھلی تاریخ پر نظر کرو۔ دیکھو نوحؑ کے بعد سے لے کر اس وقت تک کتنی قوموں کو

ہلاک کر دیا گیا خدا اپنے بندوں کے حال سے پوری طرح باخبر ہے اور اُنھیں ان کے استحقاق کے اعتبار سے بدلہ دیا کرتا ہے، لہٰذا کفار مکہ کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اب وہ جو رویہ اللہ کے رسول کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کریں گے اُسی کے اعتبار سے اُن کے ساتھ بھی معاملہ کیا جائے گا اور اب فیصلہ کن وقت قریب ہی ہے۔

اسلامی معاشرے کی بنیادیں:-

اب وہ وقت قریب آچکا تھا جب اسلام کا دورِ مظلومیت ختم ہونے والا تھا اور جلد ہی ایک ایسے معاشرے (سماج) کی تشکیل ہونے والی تھی جس کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر ہو۔ چنانچہ اس اسلامی نظام زندگی کے لئے بنیادی اصولوں کا تحفہ بھی اسی معراج کے واقعہ کے ساتھ متعلق کیا گیا یہی بنیادی اصول آئندہ اسلامی نظام زندگی کیلئے رہنما اصولوں کی حیثیت سے کام آئے وہ اصول یہ تھے۔

(۱) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو اللہ نہ بنایا جائے۔ عبادت، زندگی، اطاعت اور فرماں برداری کے حقوق میں کسی کو اُس کا ساجھی نہ ٹھہرایا جائے۔

(۲) ماں باپ کی عزت اور اطاعت کی جائے۔ (البتہ جہاں اُن کی اطاعت خدا کی اطاعت سے ٹکرائے وہاں اُن کی اطاعت نہ کی جائے۔)

(۳) رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا کیے جائیں۔ سوسائٹی میں ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں اُن کی طرف سے غفلت نہ برتی جائے۔ اُنھیں ٹھیک ٹھیک ادا کیا جائے اس کے بغیر کسی تمدن کی بنیاد درست نہیں ہوسکتی۔

(۴) فضول خرچی نہ کی جائے۔ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو غلط طریقے پر صرف کرنا شیطانی کام ہے۔ جس سوسائٹی میں لوگ اندھادھند صرف کرنے لگیں یا بالکل ہاتھ سکیڑ کر مایا کے سانپ بن بیٹھیں وہ کبھی خوش حال نہیں ہوسکتی۔ مال کے صرف کرنے اور روک کر رکھنے میں اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔

(۵) مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل نہ کرو۔ اصل میں روزی پہنچانا خدا کا کام ہے اور وہ اس کا انتظام کرتا ہے۔ تم اس اندیشے سے کہ کل کیا کھائیں گے، اپنی نسلوں کو ختم نہ کرو، یہ بہت بڑا گناہ ہے اور سوسائٹی کے لئے خودکشی کے ہم معنی ہے۔

(۶) زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ صرف یہی نہیں کہ اس گندے کام سے بچتے رہو، بلکہ ان تمام محرکات کو بھی ختم کرو جو اس ناپاک کام پر اُکساتے ہیں جو سوسائٹی اس لعنت سے پاک نہ ہوگی وہ خود اپنی جڑ کاٹے گی اور بہت جلد تباہی سے دوچار ہوگی۔

(۷) ناحق کسی کی جان نہ مارو۔ جس سوسائٹی میں لوگوں کی جان محفوظ نہ ہو وہ کبھی خوش حال نہیں ہوسکتی۔ امن کی حالت کے بغیر کوئی تمدن ترقی نہیں کرسکتا۔ اس لئے سب سے پہلے لوگوں کے جان اور مال کے تحفظ کا انتظام ضروری ہے۔

(۸) یتیم سے اچھا سلوک کرو۔ کمزور اور ایسے لوگ جو اپنے حقوق کی حفاظت خود نہیں کرسکتے امداد کے مستحق ہیں۔ جس سوسائٹی میں ایسے کمزوروں کے حقوق کا تحفظ نہ ہو وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔

(۹) اپنا عہد پورا کرو۔ عہد کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔ یہاں لوگوں کے آپس کے قول وقرار اور وعدے بھی مراد ہیں اور وہ عہد بھی مراد ہے جو ایک بندۂ

مومن ایمان لاتے وقت اپنے خدا سے کرتا ہے۔

(۱۰) ناپ تول میں پیمانے اور ترازو کو ٹھیک رکھو۔ لین دین میں معاملات کی درستی اور ایک دوسرے کے حقوق کا تحفظ سوسائٹی کے امن وسکون کے لئے انتہائی ضروری ہے، جہاں لوگوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو اور بالعموم لوگ دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے درپے ہوں وہاں کبھی باہمی اعتماد اور خوشگواری کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۱۱) جس بات کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ بغیر کسی علم کے نامعلوم باتوں کی کرید اور بلا وجہ گمان اور تخمینوں پر رائے قائم کر لینے سے معاملات ہمیشہ خراب ہوتے ہیں۔ ہر اچھی سوسائٹی کو اس عیب سے پاک ہونا چاہیے اور انسان کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے کان آنکھ اور دل سب سے باز پرس ہوگی۔

(۱۲) زمین پر مغرور بن کر نہ چلو۔ گھمنڈ اور تکبر انسان کو بدترین اخلاق قبول کرنے پر ابھارتا ہے۔ اور اس عیب کی وجہ سے انسان سوسائٹی کیلئے انتہائی مضر ثابت ہوتا ہے۔ باہمی تعلقات کی خوشگواری کیلئے ضروری ہے کہ لوگ دوسرے لوگوں کو اپنے مقابلے میں ذلیل اور کم درجہ نہ سمجھیں اور ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک نہ کریں۔

هجرت کے لئے اشارے:۔

اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب وہ کسی قوم میں اپنا رسول بھیجتا ہے تو ایک عرصہ تک لوگوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ رسول کی دعوت کو سنیں، سمجھیں اور قبول کریں۔ اس دعوت کے نتیجے میں کچھ لوگ تو اُسے قبول کر لیتے ہیں اور زیادہ تر لوگ جو مادی اغراض، باپ دادا کی اندھی تقلید اور نفس کی خواہشات میں پھنسے

ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو رد کر دیتے ہیں اور اس کی مخالفت پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ آخر کار ایک وقت وہ آتا ہے، جب یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ قوم میں جو لوگ صلاحیت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے دعوت کو قبول کر لیا اور اب اس میں ایسے لوگ باقی نہیں رہ گئے جو اس دعوت پر کان دھریں اور اس پر غور کریں۔

ایسے مرحلے پر قوم نبی سے معجزے بھی طلب کرتی ہے اور اکثر اس قوم کے سامنے معجزے پیش بھی کر دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ خود آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس دور میں معجزے طلب کیے گئے اور آپ کی ذات سے معجزوں کا ظہور ہوا۔ لیکن جب اس سب کے باوجود انکار کرنے والے انکار پر قائم رہے تو یہ فیصلہ ہو گیا کہ اب نبی کو اس قوم کے درمیان سے چلا جانا چاہیے تاکہ قوم پر عذاب آئے۔ یہ عذاب کبھی تو آسمان یا زمین کی کسی فطری قوت مثلاً زلزلہ، پانی ہوا وغیرہ کے ذریعہ آتا ہے اور کبھی مؤمنین کے ہاتھوں اس عذاب کی تکمیل ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس طریقے کی وضاحت فرمائی اور صاف صاف فرمادیا ہے کہ یہ لوگ اپنی شقاوت کی انتہا پر پہنچ کر آپ کو عنقریب اس بستی (مکہ) سے نکلنے پر مجبور کریں گے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تمہارے بعد یہ بھی یہاں اطمینان کے ساتھ رہ نہ سکیں گے۔ تم سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے ہیں، سب کے ساتھ یہی دستور رہا ہے۔ اور اب بھی اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

نماز تہجد کی اہمیت:-

ساتھ ہی ساتھ ان حالات سے نمٹنے کے لئے نماز اور خاص طور پر تہجد کی نماز کا اہتمام کرنے کی ہدایت کی اور ہجرت کی دعا تلقین فرمائی کہ اے پیغمبر اپنے

رب سے یہ دعا مانگو۔ ''اے رب مجھے اچھی جگہ پہنچائیو، اور یہاں سے اچھی طرح نکالیو اور دشمنوں پر اپنی طرف سے فتح و نصرت دیجیو'' اس کے بعد یہ بشارت بھی دی گئی کہ حق کو غلبہ ملنا اور باطل کو مٹنا ہے باطل مٹنے ہی کے لئے ہوتا ہے، بشرطیکہ حق میدان میں موجود ہو۔

اس کے بعد کفار مکہ کے ان تمام اعتراضات کے جوابات بھی دیے گئے جو وہ ہٹ دھرمی کی بنیاد پر کیا کرتے تھے اور اس طرح اُن پر ہر طرح حجت پوری کی گئی اور آخر میں عبرت کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا تذکرہ بھی کیا گیا۔

اس دور میں دعوت کی خصوصیات:-

اس دور میں جو قرآن نازل ہو رہا تھا حالات کی مناسبت سے اُس کی کچھ خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

ا۔ توکل علی اللہ اور صبر: -انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی کام کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور نتائج اس کی امید کے موافق برآمد نہیں ہوتے تو اس پر مایوسی طاری ہونے لگتی ہے۔ دعوت حق کے علم برداروں کے لئے یہی مرحلہ سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے اگر وہ خدانخواستہ مایوسی کا شکار ہو جائیں تو یہ ان کی اور دعوت کی سب سے بڑی ناکامی ہوتی ہے۔ اس مرحلے میں ثابت قدم رہنے اور نتائج کو بالکل خدا کے توکل پر چھوڑ کر مسلسل کام کیے جانے کے لئے بڑے مضبوط ایمان کی ضرورت ہے۔ اس آخری دور میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں ہدایات نازل فرمائیں۔ تقریباً ۱۲ سال کی مسلسل جدوجہد کے جو نتائج سامنے تھے وہ ایک عام نظر رکھنے

والے انسان کے لئے حوصلہ شکن ہو سکتے تھے اور اتنی طویل مدت کے بعد بھی جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا وہ بھی کچھ کم صبر آزما نہیں تھیں۔ اس لئے مومنوں کے دلوں کو مضبوط کرنے اور اُنھیں راہ حق پر جمانے کے لئے اس دور میں خصوصیت سے توجہ کی گئی۔

اس بارے میں سورۂ عنکبوت کے مضامین ایک اچھی مثال ہیں۔ جس میں مومنوں کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ ابتلا اور آزمائش تو اس راہ کی لازمی منزلیں ہیں، جس پر چلنے کا تم نے فیصلہ کیا ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کسنے کے بعد ہی دعوے ایمان میں سچے اور جھوٹے لوگوں میں تمیز ہو سکتی ہے۔ لیکن مومنوں کی اس آزمائش کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کافروں کو حقیقی معنوں میں کوئی غلبہ حاصل ہو رہا ہے اِنھیں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے مقابلے میں وہ بازی نہیں لے جا سکتے۔ بالآخر حق کا ہی بول بالا ہو کر رہے گا بشرطیکہ حق پر جمنے والے اپنے صبر اور استقامت سے اپنے کو اللہ کی امداد کا مستحق ثابت کر دیں۔ مومنوں کو بتایا گیا کہ اس راہ میں کتنی ہی گونا گوں رکاوٹیں آتی ہیں لیکن ان کو کسی سے بددل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان سے پہلے جن اللہ کے بندوں نے دعوت اسلامی کا علم بلند کیا ہے ان کو بھی ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ یاد دلا کر بتایا گیا کہ اُنھوں نے ساڑھے نو سو سال تک کیسے صبر اور استقلال کے ساتھ اپنی قوم کی مخالفت برداشت کی۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت صالحؑ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن آخر کار حق کی فتح ہوئی اور باطل کو میدان سے بھاگنا پڑا۔

۲- قرآن ایک معجزہ ہے:-

اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ کافروں کے معجزہ طلب کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مومنین کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی ایسا معجزہ ظاہر ہو جاتا جسے دیکھ کر یہ لوگ ایمان لے آتے۔ اس خواہش کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت فرمائی اس کا ذکر بھی اس سے پہلے آچکا ہے اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبیؐ کے سب سے بڑے معجزے کی صاف صاف نشان دہی کی اور لوگوں کو بتایا کہ تم جو معجزات طلب کرتے ہو تمھیں چاہیے کہ پہلے اس معجزے کو تو دیکھو جو رہتی دنیا تک انسانوں کے لئے معجزہ ہے اور جس میں ہر عقل اور سمجھ رکھنے والے انسان کی رہنمائی کا سامان ہے۔ یہ معجزہ قرآن ہے۔ حق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنے بھی معجزے عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا معجزہ قرآن ہی ہے۔

اس دور کی نازل شدہ سورت عنکبوت میں بتایا گیا ہے کہ ان مخاطبوں میں سے کون نہیں جانتا کہ آپ نے نبوت سے پہلے نہ تو کتابی علم حاصل کیا ہے اور نہ آپ لکھنا پڑھنا ہی جانتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ جو کلام پیش کر رہے ہیں وہ اتنا بلند اور ایسا حکمتوں سے بھرا ہوا ہے کہ اُن میں سے کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی اس کی مثال آج تک نہ پیش کر سکا۔ نہ کہ ایسا کلام ان کے سامنے ایک اَن پڑھ شخص کی زبان سے پیش ہو رہا ہے اس کے باوجود یہ لوگ معجزہ طلب کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ معجزہ کا ظاہر ہونا یا نہ ہونا یہ تو میرے رب کے حکم میں ہے۔ میں تو تمھیں تمھارے انجام سے صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔ البتہ تم

کو یہ غور کرنا چاہیے کہ کیا میری نبوت کے ثبوت کے لئے وہ آیات الٰہی کافی نہیں ہیں جو میں تم کو سناتا ہوں تم غور کرو تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ آیات تو سراسر رحمت اور نصیحت ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جن کے دل ایمان کی دولت سے مالا مال ہونے کے لئے اپنے اندر صلاحیت رکھتے ہوں۔

قرآن پاک کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑا معجزہ فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر معجزے عنایت کیے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن جو معجزہ مجھے مرحمت ہوا وہ وحی (قرآن) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اتارا، اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیروؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔'' قرآن ایک ایسا معجزہ ہے جو دائمی ہے۔ دوسرے معجزات وقتی تھے اور وہ ختم ہو گئے۔ لیکن یہ معجزہ قیامت تک رہے گا اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا رہے گا۔ قرآن پاک کا نظم کلام، اس کی فصاحت و بلاغت، اس میں ایسی غیب کی خبروں اور پیشین گوئیوں کا ذکر جن تک کوئی انسانی ذہن نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی قوت تاثیر، اس کے احکامات اور تعلیمات کا ایسا مفید ہونا کہ آج تک انسانی سوسائٹی کے لئے کوئی دوسرا اتنا کارآمد نظامِ حیات پیش نہ ہوسکا۔ اور باوجود موضوع کی اتنی وسعت کے اس کا ہر قسم کے تضاد اور اختلاف بیانی سے محفوظ ہونا اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ یہ سب کلام ایک ایسے شخص کی زبان سے ادا ہونا جو اصطلاحی معنیٰ میں بالکل اَن پڑھ تھا۔ یہ سب باتیں قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر ایسی دلیلیں ہیں جن کے ہوتے ہوئے آج بھی نبوت محمدیؐ پر دلوں کو اطمینان ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔

۳— دوٹوک بات:-

اس دور کے نازل شدہ کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اب کفار سے بات بالکل صاف صاف اور دوٹوک کہی جانے لگی۔ جس کا انداز یہ تھا کہ اب سمجھانے اور بتانے کی حد ہوگئی۔ ماننا ہے تو اب بھی موقع ہے مان لو نہیں تو اپنے انکار اور ضد کے نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہو۔

چنانچہ کہا گیا کہ [۱] میں تو اپنے رب کی طرف سے آئی ہوئی ایک روشن دلیل پر قائم ہوں لیکن تم اسے جھٹلا رہے ہو اور مطالبہ کرر ہے ہو کہ اس انکار کی پاداش میں جو عذاب آنا ہے وہ آجائے لیکن میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ میرے قبضے میں وہ چیز نہیں ہے جس کی تم جلدی مچا رہے ہو۔ اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے۔ اگر میرے قبضے کی بات ہوتی تو معاملہ کبھی کا چکا دیا گیا ہوتا۔ غیب کا علم اللہ کو ہے، وہ جانتا ہے کہ کس کام کے لئے کون سا وقت مناسب ہے، وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ جب چاہے تمھارے اوپر عذاب بھیج دے۔ پھر اسی سلسلے میں آگے چل کر ہدایت دی گئی کہ جن لوگوں نے دین کے معاملے کو ایک کھیل سمجھ رکھا ہے اور وہ دنیا کی زندگی میں مست ہیں، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ البتہ اُنھیں یہ قرآن برابر سناتے رہو۔ اس پر بھی نہ مانیں تو اُن سے کہہ دو کہ لوگو! تم اپنی جگہ پر وہ عمل کرتے رہو، جو تم کرنا چاہتے ہو، میں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں۔ نتیجہ جلد ہی تمھارے سامنے آجائے گا اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھے راستے پر تھا۔

یہ ایک مثال ہے اس قسم کے طرز کلام کی۔ اس کے علاوہ بھی اس دور کی وحی میں یہ انداز واضح طور پر سامنے آتا ہے، اور یہ گویا اعلان تھا اس بات کا کہ اب بات کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے والی ہے۔

---

[۱] سورۂ انعام آیت ۶۰ تا ۷۰ ۱۱ اور ۱۳۴ و ۱۳۵ کے پیش نظر

۴۔ هجرت کے لئے تیاری:۔

اس کے علاوہ ہجرت کے لئے صاف صاف اشارے بھی اس دور کے کلام میں بار بار سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں ہدایت دی گئی کہ اے میرے بندو! بندگی تو میری ہی کرتے رہنا اگر میری بندگی کی وجہ سے تمھارے اپنے وطن کی زمین تمھارے لئے تنگ ہوگئی ہے، تو اس کی پرواہ نہ کرنا، میری زمین بہت وسیع ہے۔ مراد یہ کہ چاہے گھر بار چھوٹ جائے۔ لیکن میری بندگی کا رشتہ نہ ٹوٹنے پائے۔ زیادہ سے زیادہ جو خطرہ کسی جاندار کو ہوسکتا ہے وہ موت کا خطرہ ہے۔ تو یقین رکھو کہ مرنا تو ہر ایک کو ہے اور پھر پلٹ کر میرے ہی پاس آنا ہے تو اگر میری ہی راہ میں موت آئے تو پھر فکر کس بات کی ہے جو کوئی ایمان اور عمل صالح کی پونجی لے کر آئے گا۔ اسے ایسے باغوں میں آرام سے رکھا جائے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ کیسا اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کے لئے۔ ایسے عمل کرنے والے جو سخت سے سخت حالات میں بھی اللہ کے دین کی راہ پر جمے رہے اور جنھوں نے اپنی ہر جدوجہد کرتے وقت بھروسہ اپنے رب پر ہی رکھا۔

پھر یہ بتایا گیا کہ اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑنے کا دوسرا اندیشہ معاشی بدحالی کا ہے۔ اس بارے میں اُن کے اس ایمان کو مضبوط کیا گیا کہ دراصل رزق کا معاملہ بالکل خدا کے ہاتھ میں ہے، دیکھو زمین پر چلنے والے کتنے ہی جاندار ہیں جو اپنا رزق اپنے ساتھ اٹھائے اٹھائے نہیں پھرتے۔ لیکن اللہ اُن کا رزق مہیا کرتا ہے اور اُنھیں کھانے کو دیتا ہے تو آخر تم ہی اس کی رزاقیت سے ایسے مایوس کیوں ہوتے ہو کہ وہ تمھیں رزق نہ دے گا۔

اس کے علاوہ اس دور کی ایک اور سورت بنی اسرائیل میں ہجرت کے لئے دعا بھی سکھائی گئی، کہا گیا کہ دعا یوں مانگو کہ ''اے رب! مجھے اچھی جگہ پہنچائیو، اور (مکہ) سے اچھی طرح نکالیو، اور دشمنوں پر اپنی طرف سے فتح ونصرت دیجیو۔ اور اے پیغمبر اعلان کردو کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل کو مٹ ہی جانا تھا۔''

غرض یہ کہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے ایسے اشارات ہیں جو اس دور کے کلام میں ملتے ہیں۔ جن میں ایک طرف تو اس آنے والے انقلاب کی طرف اشارے کیے جا رہے تھے، اور دوسری طرف ان حالات سے نمٹنے کے لئے جس تیاری کی ضرورت تھی اُس پر بار بار متوجہ کیا جا رہا تھا۔ آخرت کا زندہ یقین دنیا کی نعمتوں کی آرزو کا دلوں سے کھود کھود کر نکال پھینکنا، توحید خالص اور اس کے تقاضوں کا اچھی طرح ذہن نشین کرنا، اللہ کے علاوہ کسی دوسرے سہارے کو دل میں کوئی جگہ نہ دینا، صرف اُسی کی ذات پر مکمل بھروسہ کرنا، جو کچھ ہدایات اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی تھیں، اُن کو بلا کچھ گھٹائے بڑھائے برابر پیش کرتے رہنا اور ان سب کاموں کے واسطے تقویت حاصل کرنے کے لئے نماز قائم کرنا اور اس پر پوری پوری توجہ دینا، یہ اور اسی طرح کی دوسری بنیادیں تھیں جن پر مسلمانوں کی تربیت کی جا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اُنھیں ان سخت حالات میں بھی دین کی تبلیغ کرنے کے لئے ضروری ہدایات دی جا رہی تھیں۔

✦✦

ساتواں باب

ہجرت

اسلامی اصطلاح میں صرف اللہ کے دین کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی ایسی دوسری جگہ چلے جانا جہاں دین کے تقاضے پورے ہو سکیں، ہجرت کہلاتا ہے۔ مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ محض کاروبار، گھر اور جائیداد یا اعزّہ واقارب کی خاطر کسی ایسی جگہ سے چمٹا رہے، جہاں اس کے لئے اسلامی زندگی بسر کرنے اور اللہ کے دین کی دعوت دینے کی آزادی نہ ہو۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اُس کے لئے کسی نظامِ کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ اس سرزمین میں اسلام کو غالب کرنے اور نظامِ کفر کو نظامِ اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح کہ اب تک مسلمان مکے میں رہ کر برابر کر رہے تھے اور اس کام کے مقابلے میں ہر قسم کی سختیاں جھیل رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو۔ یا اس کے لئے کوئی ایسی جگہ میسر نہ ہو جہاں وہ اسلامی زندگی گزارنے اور نظام اسلام کو برپا کرنے کی جدوجہد کر سکے۔ [1] لیکن جب کوئی ایسا مقام میسر آجائے جہاں

[1] یہ بات پیش نظر رہے کہ ہجرت کے لئے کسی دارُ الاسلام کا موجود ہونا شرط نہیں ہے۔ مسلمان کے لئے احکامِ کفر کی اطاعت سے بچنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کسی جنگل اور کسی پہاڑ میں جا کر زندگی بسر کر سکے۔ مسلمان کی نظر میں ہر چیز کے بچانے سے زیادہ دین کے بچانے کی اہمیت ہے۔

دین کے تقاضے پورے ہوسکیں، جیسا کہ اب مدینہ کی سرزمین سے اُمیدیں قائم ہوچکی تھیں، تو ایسی صورت میں صرف وہی لوگ قابل معافی ہوتے ہیں جو انتہائی معذور اور مجبور ہوں اور کسی طرح سفر کے قابل نہ ہوں خواہ بیماری کی وجہ سے یا مفلسی کی بناء پر۔

عام مسلمانوں کی مدینہ کو ھجرت:-

مدینہ میں جب اسلام کی اشاعت ایک حد تک ہوچکی تو اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام مسلمانوں کو جو مکے میں کافروں کے ہاتھوں ستائے جارہے تھے۔ اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ مدینہ کو ہجرت کر جائیں، یہ دیکھ کر کافروں نے مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لئے مظالم اور بڑھا دیئے اور ہر طرح کوشش کی کہ یہ لوگ اُن کے چنگل سے نکل کر جا بھی نہ سکیں۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے مال، جان اور اولاد کو خطرے میں ڈال کر اللہ کے دین کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ دینا ہی پسند کیا اور کوئی لالچ اور دباؤ اُنھیں اُن کے ارادے سے نہ روک سکا۔ رفتہ رفتہ بہت سے صحابہؓ مدینہ تشریف لے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے یا کچھ ایسے مسلمان رہ گئے جو مفلسی کی وجہ سے مجبور تھے اور سفر نہیں کر سکتے تھے۔

آنحضرتؐ کے قتل کا مشورہ:-

جب نبوت کا تیرہواں سال شروع ہوا تو اس وقت تک بہت سے صحابہؓ ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے۔ اب قریش نے دیکھا کہ مسلمان تو مدینہ میں جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جا رہا ہے تو اُنھیں بڑی

تشویش ہوئی اور اُنھوں نے اسلام کو آخری طور پر ختم کرنے کے لئے تدبیریں سوچنا شروع کیں۔ عام قومی مسائل پر سوچ بچار کرنے کے لئے دارُالندوہ یا مشورے کی ایک جگہ مقرر تھی۔ وہاں ہر قبیلے کے بڑے بڑے سردار جمع ہوئے اور یہ سوچنا شروع کیا کہ اب اِس تحریک کو ختم کرنے کے لئے کیا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو زنجیروں سے جکڑ کر کسی مکان میں بند کر دیا جائے۔ لیکن یہ مشورہ اس لئے رد کر دیا گیا کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اُن کو ہم سے چھڑا لے جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کے مقابلے میں شکست ہو جائے۔

ایک مشورہ یہ دیا گیا کہ اُنھیں جلاوطن کر دیا جائے۔ لیکن یہ بھی اس لئے پسند نہ کیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جائیں گے وہاں ہی اُن کے پیرو پیدا ہونے لگیں گے اور اُن کی تحریک برابر بڑھتی چلی جائے گی۔ آخر کار ابوجہل نے یہ مشورہ دیا کہ ہر ہر قبیلے میں سے ایک ایک جوان منتخب کیا جائے۔ اور یہ سب مل کر ایک ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کریں اور اُنھیں قتل کر دیں۔ اس طرح اُن کا خون تمام قبیلوں میں بٹ جائے گا۔ اور خاندانِ ہاشم کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ تمام قبیلوں کے مقابلے میں اکیلے جنگ کر سکیں۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا اور بالآخر اس کام کے لئے ایک رات مقرر کر لی گئی اور یہ طے پایا کہ اس رات کو سب منتخب لوگ آپ کے گھر کو گھیر لیں اور جب آپؐ صبح باہر تشریف لائیں تو یہ اپنا کام کر ڈالیں عرب والے رات کو بے خبری کے عالم میں کسی کے گھر میں گھسنا پسند نہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا کرنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دشمنوں کی ان خفیہ تدبیروں کا علم ہوتا رہا اور اب وہ وقت آ گیا کہ وحی کے ذریعہ آپ کو یہ حکم مل گیا کہ اب آپ بھی مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے جائیں۔ چنانچہ اس ہجرت سے دو تین دن پہلے آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا اور یہ طے ہو گیا کہ آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ تشریف لے جائیں گے۔ سفر کے لئے اونٹنیاں بھی تجویز ہو گئیں اور مختصر سازادراہ بھی تیار کر لیا گیا۔

مکے سے روانگی:-

کفار قریش نے جو رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کرنے کیلئے طے کی تھی۔ اس رات کو آپ نے حضرت علی کو بلایا اور فرمایا کہ مجھے ہجرت کا حکم مل چکا ہے میں آج رات مدینہ روانہ ہو جاؤں گا۔ میرے پاس بہت سے لوگوں کی امانتیں جمع ہیں یہ تم صبح اُن لوگوں کو واپس کر دینا اور آج رات تم میرے بستر پر سوتے رہنا تاکہ دیکھنے والے مطمئن رہیں کہ میں گھر میں موجود ہوں۔

کفار قریش ایک طرف تو آپ کے خون کے پیاسے تھے۔ لیکن اس حال میں بھی آپ ہی کو ایسا امانت دار اور دیانت دار سمجھتے تھے کہ اپنی امانتیں اور مال لا لا کر آنحضرتؐ کے پاس رکھتے تھے۔

رات کو کفار نے آپ کا گھر گھیر لیا۔ جب رات زیادہ ہوئی تو آپ خاموشی اور اطمینان کے ساتھ مکان سے باہر نکلے اس وقت آپ سورۂ یٰسٓ کی آیت فَاَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَايُبْصِرُوْنَ ۝ تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ نے ایک مٹھی خاک بھر شاھت الوجوہ (چہرے بگڑ جائیں) فرماتے

ہوئے کفار کی طرف پھینکی اور اُن کے درمیان سے ہوکر تشریف لے گئے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اُن محاصرہ کرنے والوں پر کچھ ایسی غفلت طاری ہوئی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف لے جاتے ہوئے دیکھ ہی نہ سکے۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے اور وہاں سے اُن کے ہمراہ مکے سے باہر جا کر غارِ ثور میں چھپ گئے۔

غار ثور میں پناہ:۔

حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ جو اُس وقت نوعمر تھے۔ رات کو ان صاحبان کے پاس رہتے اور صبح مکے میں آ کر پتہ چلاتے کہ کفار اب کیا مشورہ کر رہے ہیں، جو کچھ معلوم ہوتا اس سے ان دونوں بزرگوں کو بھی باخبر کرتے رہتے۔ کچھ رات گئے حضرت ابوبکرؓ کا غلام بکریوں کا دودھ لے آتا یا کبھی گھر سے کچھ کھانا پہنچ جاتا۔ اس طرح تین راتوں تک یہ دونوں صاحبان وہاں ٹھہرے رہے۔

صبح کو جب کافروں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے ہجرت فرما گئے تو بہت پریشان ہوئے اور آپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ ایک بار یہ لوگ آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے عین اُس غار کے منہ تک آ گئے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہٗ چھپے ہوئے تھے، اُن لوگوں کے قدموں کی آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ کچھ پریشان ہوئے۔ اس لئے نہیں کہ اُنھیں اپنی جان کا خطرہ تھا بلکہ اس لئے کہ کہیں اللہ کے رسولؐ کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔ آپ نے اُن کی گھبراہٹ دیکھ کر نہایت اطمینان کے ساتھ اُنھیں تسلی دی اور فرمایا:۔

لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا: گھبراؤنہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔(توبہ)

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے غار کے منہ پر کچھ ایسی علامتیں پیدا ہوگئیں کہ[1] اُنھیں دیکھ کر کافروں نے سمجھا کہ اس غار میں کوئی داخل نہیں ہوا ہے۔:

ساتھ ہی کفار قریش نے یہ اعلان کردیا کہ اگر کوئی شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے لائے گا تو اُسے ۱۰۰ اونٹ انعام دیا جائے گا۔ اس انعام کا اعلان سن کر کتنے ہی آدمی آپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل کھڑے ہوئے۔

مدینه تك سفر:-

چوتھے دن آنحضرتؐ غارِ ثور سے نکلے اور ایک رات اور ایک دن برابر سفر کرتے رہے۔ سفر کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تیار کی ہوئی دو عمدہ اونٹنیاں پہلے سے طے ہو چکی تھیں، راستہ بتانے کے لئے بھی ایک جاننے والے کو مقرر کرلیا گیا تھا۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت جب دھوپ تیز ہوگئی تو ایک چٹان کے سایہ میں کچھ دیر آرام کرنے کے لئے ٹھہرے، قریب ہی کوئی چرواہا مل گیا۔ اس کی بکریوں کا دودھ پیا اور پھر وہاں سے روانہ ہوئے۔ جس وقت آپ روانہ ہو رہے تھے کہ اچانک ایک شخص سراقہ بن جعشمؓ نے آپ کو دیکھ لیا۔ یہ شخص انعام کے لالچ میں آپ کی تلاش میں نکلا تھا۔ اُس نے آپ کو دیکھ کر اپنا گھوڑا دوڑایا۔ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ لیکن وہ پھر سنبھلا اور پھر حملہ کرنے

[1] کہا جاتا ہے کہ مکڑی نے غار کے منہ پر جالا تان دیا تھا اور کسی کبوتر نے اپنا گھونسلا رکھ لیا تھا، جسے دیکھ کر دیکھنے والوں کو یہی یقین ہوا کہ اس غار میں عرصہ سے کوئی داخل نہیں ہوا ہے۔

کے لئے تیار ہوا۔ اب جو آگے بڑھا تو اللہ کی قدرت کہ اُس کے گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ اَب تو سراقہ پریشان ہو گیا اور سمجھ گیا کہ معاملہ دوسرا ہے۔ میں، محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ نہ کرسکوں گا۔ اور فوراً ڈر کر اپنے آپ کو حضرتؐ کے حوالے کر دیا اور اماں کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو معاف کر دیا اور اماں دے دی۔ یہ بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ تھا۔

مدینے میں تشریف آوری:-

آپؐ کے تشریف لانے کی خبر مدینہ میں پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اور پورا شہر آپ کی تشریف آوری کا منتظر تھا۔ بچے اور بڑے ہر روز سویرے شہر سے نکل کر باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے لوٹ آتے۔ آخر ایک دن وہ مبارک گھڑی آہی گئی جس کے یہ لوگ منتظر تھے۔ دور سے آپ کے آنے کی علامات دیکھ کر سارا شہر تکبیر کی آوازوں سے گونج اٹھا اور ہر منتظر دل کی کلی کھِل گئی۔ مدینے سے تین میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔ قبا۔ یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے۔ اُن میں عمرو بن عوف کا خاندان سب سے ممتاز تھا اور کلثوم بن الہدم اُس کے افسر تھے۔ یہ سعادت اُن کی قسمت میں تھی کہ سرکار دو عالم نے سب سے پہلے اُن کی مہمانی قبول فرمائی اور آپ نے قبا میں اُن کے مکان پر قیام فرمایا۔ حضرت علی جو آپ کے روانہ ہونے کے تین دن بعد چلے تھے وہ بھی تشریف لے آئے اور یہاں ہی قیام فرمایا۔

قبا میں آپ کی تشریف آوری نبوت کے تیرہویں سال ۸/ ماہ ربیع الاول

(مطابق ۲۰ر ستمبر ۶۲۲ء) کو ہوئی۔ قبا کے قیام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کام ایک مسجد کی تعمیر تھا۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے مسجد کی بنا ڈالی اور دوسرے صحابہؓ کے ساتھ مل کر خود اس مسجد کی تعمیر کی۔ چند روز قبا میں ٹھہر کر آپ شہر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ راستے میں بنی سالم کے محلے میں نماز ظہر کا وقت ہوگیا تو آپ نے سب سے پہلا جمعہ کا خطبہ دیا اور سب سے پہلی جمعہ کی نماز پڑھائی۔ مدینہ میں داخلے کے وقت ہر جاں نثار کی آرزو تھی کہ مہمانی کا شرف اُس کے حصے میں آئے۔ ہر قبیلہ سامنے آکر عرض کرتا کہ ''حضور یہ گھر ہے۔ یہاں قیام فرمائیں۔'' لوگوں کے شوق اور ذوق کا یہ عالم تھا کہ ہر دل فرشِ راہ تھا اور ہر جان قربان ہونے کے لئے بے چین، خواتین مکانوں کی چھتوں پر گا رہی تھیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا	چودھویں کا چاند نکل آیا
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوِدَاعِ	کوہ وِداع کی گھاٹیوں سے
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا	ہم پر خدا کا شکر واجب ہے
مَادَعَىٰ لِلّٰهِ دَاعٍ	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں

معصوم لڑکیاں دف بجا کر گا رہی تھیں:۔

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ ہم خاندان نجّار کی لڑکیاں ہیں:

يَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِّنْ جَارٍ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیسے اچھے ہمسائے ہیں

آپ نے ان لڑکیوں سے پوچھا کیا تم مجھ سے محبت رکھتی ہو؟ وہ بولیں ''ہاں'' فرمایا۔ ''میں بھی تم سے محبت رکھتا ہوں۔''

مدینہ میں قیام:-

میزبانی کا شرف کیسے حاصل ہو؟ یہ ایک سوال تھا۔ جس کا تصفیہ آسان نہ تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میری اونٹنی جس کے مکان کے سامنے ٹھہر جائے وہی اس خدمت کو انجام دے۔ چنانچہ یہ شرف حضرت ابوایوب انصاری کے حصے میں آیا جہاں اب مسجد نبویؐ ہے اس کے قریب اُن کا مکان تھا۔ یہ مکان دومنزلہ تھا اُنھوں نے بالا خانہ پیش کیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی آمدورفت کی سہولت کی وجہ سے نیچے کی منزل میں رہنا پسند فرمایا اور حضرت ابوایوب انصاریؓ اوران کی زوجہ کے حصے میں اوپر کی منزل آئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات مہینے تک یہیں قیام فرمایا۔ اس کے بعد جب مسجد نبویؐ کے قریب آپ کے قیام کے لئے حجرے تعمیر ہو گئے تو وہاں منتقل ہو گئے تھوڑے ہی دنوں کے اندر آپ کے خاندان کے لوگ بھی مدینہ چلے آئے۔

مسجدنبویؐ کی تعمیر:-

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا اور ضروری کام ایک مسجد کی تعمیر تھا۔ جہاں آپ نے قیام فرمایا تھا اس کے قریب ہی کچھ زمین افتادہ تھی جو دو یتیموں کی تھی۔ اُن کو قیمت دے کر یہ زمین حاصل کی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس وقت بھی آپ مزدوروں کی طرح سب کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے اور پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ یہ مسجد بہت ہی سادہ طریقے پر بنائی گئی تھی۔ کچی اینٹوں کی دیواریں، کھجور کی پتیوں کی چھت، کھجور کے تنوں کے ستون۔ اس مسجد کا قبلہ بیت

المقدس کی طرف رکھا گیا کیونکہ ابھی تک مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی تھا۔ پھر جب قبلہ کعبہ کی طرف ہوگیا تو مسجد میں بھی اسی نسبت سے ترمیم کردی گئی۔ مسجد کا فرش کچا تھا بارش ہوتی تو مسجد میں کیچڑ ہوجاتی تھی کچھ دنوں کے بعد پتھروں کا فرش بنالیا گیا۔

مسجد کے ایک سرے پر ایک پٹا ہوا چبوترہ تھا جسے صُفہ کہتے تھے۔ یہ اُن لوگوں کے ٹھہرنے کا مقام تھا جو اسلام لائے تھے لیکن اُن کا کوئی گھر در نہ تھا۔

جب مسجد بن چکی تو اُس کے قریب ہی آپؐ نے ازواجِ مطہرات کے لئے حجرے بنوالیے۔ یہ بھی کچی اینٹوں اور کھجور کی ٹیٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ یہ مکان چھ چھ سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو تو چھت کو چھولے۔ دروازوں پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا۔

آنحضرتؐ کے مکان کے قریب جو انصار رہتے تھے، اُن میں کھاتے پیتے لوگ آپ کی خدمت میں کچھ دودھ بھیج دیا کرتے تھے، کبھی سالن اور کبھی کچھ اور بس اسی پر بسر تھی۔ زندگی تنگی کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔

مواخات (بھائی بنانا):-

مکے سے جو مسلمان گھر بار چھوڑ کر مدینہ آ گئے تھے۔ وہ تقریباً سب ہی بے سروسامان تھے۔ اُن میں جو لوگ کھاتے پیتے تھے۔ وہ بھی اپنا مال مکے سے نہیں لا سکے تھے اور اُن کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یوں ہی آنا پڑا تھا۔ اگرچہ یہ سب مہاجر مدینہ کے مسلمانوں (انصار) کے مہمان تھے۔ لیکن بہر حال اب اُن کے مستقل قیام کے بندوبست کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ یوں بھی یہ لوگ اپنے ہاتھوں

سے محنت کر کے زندگی بسر کرنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ جب مسجد نبویؐ کی تعمیر ختم ہوگئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن انصار کو بلایا اور اُن سے فرمایا کہ یہ مہاجر تمھارے بھائی ہیں۔ پھر آپ نے ایک شخص کو انصار میں سے اور ایک کو مہاجرین میں سے بلا کر فرمایا کہ آج سے تم دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہو۔ اس طرح سب مہاجرین کو انصار کا بھائی بنا دیا اور یہ اللہ کے مخلص بندے سچ مچ بھائی ہی کیا بھائی سے بھی کہیں زیادہ ایک دوسرے کے رفیق بن گئے۔ انصار مہاجرین کو اپنے گھر لے گئے۔ اور اپنی کل جائیداد اور سامان کا حساب اُن کے سامنے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ آدھا تمھارا اور آدھا ہمارا۔ باغات کی آمدنی، کھیتی کی پیداوار، گھر کا سامان، مکان، جائداد غرض یہ کہ ہر چیز ان میں بھائیوں کی طرح تقسیم ہوگئی۔ اور یہ بے گھر مہاجر سب کے سب اطمینان سے ہوگئے۔ ساتھ ہی بہت سے مہاجروں نے کاروبار بھی شروع کر دیا۔ دوکانیں کھول لیں اور دوسرے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ اس طرح مہاجروں کے بسانے کا کام انجام پایا اور اس طرف سے اطمینان حاصل ہوا۔

++

آٹھواں باب

دعوتِ اسلامی ایک نئے دور میں

ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت مکہ کے مشرکوں کے سامنے دی جارہی تھی۔ ان کے لئے اسلام کی دعوت ایک نئی چیز تھی لیکن ہجرت کے بعد مدینہ میں یہود سے سابقہ پیش آیا۔ یہ لوگ توحید، رسالت، آخرت، ملائکہ، وحی وغیرہ کے قائل تھے اور ایک پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُمتی ہونے کے لحاظ سے خدا کی طرف سے آئی ہوئی ایک شریعت کے ماننے کے بھی مدعی تھے۔ اصولاً ان کا اصل دین وہی اسلام تھا جس کی طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے تھے۔ یہ بات دوسری تھی کہ صدیوں کی لاپرواہی کی وجہ سے ان کے اندر بے شمار خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ ان کی زندگی اصل خدائی شریعت کے ضابطوں سے آزاد ہوگئی تھی اور اس میں سیکڑوں قسم کی بدعتیں اور رسم ورواج داخل ہو گئے تھے۔ توراۃ ان کے پاس ضرور تھی لیکن اس میں اُنھوں نے بہت سا انسانی کلام شامل کرلیا تھا اور جو کچھ خدائی احکام باقی بھی رہ گئے تھے اُنھیں اپنی من مانی تاویلوں اور تشریحوں کے سانچوں میں ڈھال کر کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ خدا کے دین سے ان کا تعلق انتہائی کمزور ہوگیا تھا اور اجتماعی طور پر ان کے اندر ایسی خرابیاں جڑ پکڑ گئی تھیں کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ اُنھیں سیدھا راستہ دکھانے کے لئے

کبھی آیا بھی تو اُنھوں نے اس کی ایک نہ سنی بلکہ اُسے اپنا سب سے بڑا دشمن جانا اور ہر طرح اس کی آواز دبانے کی کوشش کی۔ اگر چہ یہ لوگ اپنی اصل کے لحاظ سے ''مسلم'' ہی تھے لیکن اب اتنے بگڑ گئے تھے کہ اُنھیں خود بھی یہ یاد نہ رہا تھا کہ دراصل ان کا دین کیا تھا۔

اس لحاظ سے اب تحریک اسلامی کے سامنے صرف دین کے اصولوں کی بنیادی تعلیم ہی سے لوگوں کو متعارف کرانے کا کام نہ تھا بلکہ ایسے لوگوں میں پھر سے دینی روح بیدار کرنے کا کام بھی تھا جو ایک اعتبار سے ''بگڑے ہوئے مسلم'' تھے پھر اس کے علاوہ اب مدینے میں چاروں طرف سے آکر مسلمان اکٹھا ہو رہے تھے اور ان مہاجرین اور مدینے کے انصار سے مل کر ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ اس لئے اب تک تو تحریک کو صرف اصولی دعوت، عقائد کی اصلاح اور کچھ اخلاقی تعلیمات کی حد تک ہدایات دینا تھیں لیکن اب رہن سہن کے طریقوں کی اصلاح انتظامی قوانین اور آپس کے تعلقات درست کرنے کے ضابطوں کی ضرورت تھی چنانچہ اب اس طرف بھی پوری توجہ دی جانے لگی تھی۔

ایک دوسری بڑی تبدیلی اور ہوئی۔ اب تک اسلام کی دعوت خود کفر کے ماحول میں دی جارہی تھی اور وہاں رہ کر مسلمان کافروں کے مظالم برداشت کر رہے تھے لیکن اب ان کی اپنی ایک آزاد چھوٹی سی ریاست بن گئی تھی جو چاروں طرف کفر کے قلعوں سے گھری ہوئی تھی اور اب معاملہ صرف ستانے اور پریشان کرنے کا ہی نہیں تھا بلکہ پورا عرب اب اس بات پر تلا ہوا تھا کہ اس مٹھی

بھر جماعت کو جلد سے جلد ختم کر دیا جائے نہیں تو اُنھیں یہ خطرہ سامنے نظر آ رہا تھا کہ اگر اسلام کے اس نئے مرکز نے طاقت حاصل کرنا شروع کر دی تو پھر ان کے لئے ٹھہرنے کا کوئی مقام نہ رہ جائے گا۔ اس لئے اب اس مختصر سی اسلامی جماعت کے لئے اپنے اور اپنی تحریک کے بچاؤ کے لئے ضروری تھا کہ:۔

(۱) وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کریں۔ اس کا حق ہونا دلائل سے ثابت کریں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں۔

(۲) مخالفین جن عقیدوں پر جمے ہوئے تھے ان کا غلط ہونا دلائل سے ثابت کریں تا کہ جو شخص بھی عقل کی روشنی میں بات سمجھنا چاہے، اس کے لئے اصل حقیقت تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

(۳) گھر بار چھوڑنے اور کاروبار کو ختم کر دینے کے بعد جو لوگ اس نئی ریاست میں آ آ کر جمع ہو رہے تھے ان کے لئے نہ صرف یہ کہ جماؤ کا کوئی انتظام کیا جائے بلکہ ان کی ایسی اخلاقی اور ایمانی تربیت کی جائے کہ فقر وفاقہ اور بے اطمینانی کی حالت میں وہ پورے صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر سکیں اور کسی سخت سے سخت موقع پر بھی ان کے قدم نہ ڈگمگانے پائیں۔

(۴) مسلمانوں کو اس بات کے لئے بالکل تیار کر دیا جائے کہ جب ان کو مٹا ڈالنے کے ارادے کے ساتھ مخالفین ان پر حملہ کریں تو باوجود اپنی کمزوری اور بے سروسامانی کے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کر سکیں اور ان کو اپنے مسلک کی سچائی پر ایسا یقین اور اپنے خدا پر ایسا بھروسہ ہو کہ وہ کبھی میدان سے منہ نہ موڑیں۔

(۵) تحریک کے علمبرداروں میں اتنی ہمت پیدا کردی جائے کہ جو لوگ سمجھانے کے باوجود اُس نظام زندگی کے قائم ہونے میں آڑے آئیں جو اسلام قائم کرنا چاہتا تھا تو ان کو قوت کے ساتھ میدان سے ہٹادیں۔

چنانچہ مسجد نبوی اور دوسری ضروری عمارتوں کے انتظام اور مہاجرین کے لئے مستقل قیام کا ٹھکانہ کردینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام کاموں کی طرف توجہ فرمائی۔ سورۂ بقرہ کا ایک بڑا حصہ اسی دور میں نازل ہوا۔ اس میں ان ہی تمام باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

یہود سے معاہدے:-

مدینے کے چاروں طرف یہود کی بستیاں تھیں۔ ان لوگوں میں اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ ان سے سیاسی تعلقات کی نوعیت متعین ہوجائے کیونکہ مکے کے قریش یہ جان کر کہ مسلمان مکے سے چلے گئے، مطمئن ہوکر نہیں بیٹھ گئے تھے بلکہ جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی ایک منظّم جماعت مدینے میں اکٹھا ہورہی ہے تو اُنھوں نے اسلام کے اس مرکز کو اپنی طاقت کے بل پر مٹاڈالنے کی تدبیریں سوچنا شروع کردیں تھیں اس لئے ضروری تھا کہ مدینے کے چاروں طرف یہود کی جو بستیاں تھیں ان سے مسلمان اپنے سیاسی تعلقات واضح طور پر متعین کرلیں تاکہ مشرکین مکہ کے کسی حملے کے وقت یہ اندازہ ہوسکے کہ یہود کی طاقت کس طرف ہوگی چنانچہ مدینہ اور ساحل بحر احمر کے درمیان جو قبیلے آباد تھے ان کے ساتھ بات چیت شروع ہوئی ان میں سے بعض سے آپ نے غیر جانب داری کا معاہدہ لے لیا۔

یعنی یہ کہ اگر مدینہ کے مسلمانوں پر قریش یا کوئی اور حملہ کرے گا تو یہ لوگ نہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑیں گے اور نہ مسلمانوں کے دشمنوں کا ساتھ دیں گے اور بعض قبیلوں سے یہ معاہدہ لے لیا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی حملہ کرے گا تو یہ لوگ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔

منافقین:-

مدینے میں تحریک اسلامی کو اس وقت جن نئے حالات سے سابقہ پڑ رہا تھا ان میں ایک مسئلہ منافقین کا بھی بڑا اہم تھا۔ مکے کے آخری دور میں کچھ ایسے لوگ تو اسلامی جماعت میں آ گئے تھے جو اگرچہ اسلام کی دعوت کو بالکل برحق جانتے تھے لیکن اپنے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے وہ اسلام کی خاطر اپنے دنیاوی تعلقات کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ تجارت، زراعت یا عزیز داری کی بندشیں اِنھیں اکثر اسلام کے تقاضے پورا کرنے سے روک دیتی تھیں لیکن اب مدینے میں کچھ ایسے منافق بھی اسلامی جماعت میں گھس آئے تھے جو واقعتاً اسلام کے بالکل منکر تھے لیکن محض فتنہ برپا کرنے کے لئے وہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے یا پھر کچھ لوگ ایسے تھے جو مجبوراً اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے۔ ان کے دل تو اسلام پر مطمئن نہیں تھے مگر چونکہ قبیلے یا خاندان کے بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے تھے اس لئے وہ بھی مجبوراً مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے موقعہ پرست لوگ بھی جماعت میں گھس آئے تھے جو ایک طرف تو مسلمانوں کے ساتھی بن کر اپنے دنیاوی فائدے حاصل کرنے کی فکر کرتے تھے اور دوسری طرف کافروں سے بھی ساز باز رکھتے تھے۔ ان لوگوں

کی تدبیر یہ تھی کہ اگر اسلام اور کفر کی کشمکش میں اسلام غالب آ جائے تو ان کو اسلام کے دائرے میں امن مل جائے اور اگر جیت کفر کی ہو جائے تب بھی ان کے مفاد محفوظ رہیں۔

اسلامی تحریک کے لئے یہ آستین کے سانپ کافی مشکلات کا باعث تھے اور ان سے نمٹنا آسان کام نہ تھا۔ مدینے کی پوری زندگی میں ان لوگوں کے فتنوں کا مقابلہ کیسے کیسے کیا گیا اس کا ذکر تو اپنے مناسب مقامات پر آئندہ آتا رہے گا اس موقعہ پر اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ایسے منافقین اور اسلام کی راہ پر سوچ سمجھ کر قدم رکھنے والے سچے مومنین بالکل ایک دوسرے کے مقابلے میں پہچان لیے جائیں۔ کیونکہ اب اسلامی تحریک کو جن حالات سے دوچار ہونا تھا ان میں اس بات کی بڑی سخت ضرورت تھی کہ جو لوگ ابھی تک پرانے تعصّبات اور غیر اسلامی خیالات کے غلام تھے یا جن کے ایمان میں کسی پہلو سے کمزوری تھی۔ وہ لوگ چھٹ کر الگ ہو جائیں۔

قبلے کی تبدیلی:۔

اب تک اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ مسلمان اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ بیت المقدس کا تعلق یہودیوں سے بہت ہی قریب تھا یہودی بھی اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ شعبان ۲ھ کا واقعہ ہے کہ عین نماز کی حالت میں قبلے کے بدلنے کا حکم نازل ہوا اور اب بیت المقدس کے بدلے کعبے کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عین نماز کی حالت میں اپنا رخ بیت المقدس کی طرف سے بدل کر کعبے کی طرف

کرلیا۔ یہ واقعہ تحریک اسلامی کی تاریخ میں بڑا اہم تھا اس کی اہمیت کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ ''ہم نے جو کعبہ کو تمہارا قبلہ بنا دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون پیغمبر کا پیرو ہے اور کون الٹا پیچھے پھر جانے والا ہے۔'' (البقرہ) ساتھ ہی ساتھ یہ اس امر کا اعلان بھی تھا کہ اب تک دنیا کی اخلاقی اور ایمانی رہنمائی کا جو کام یہود کو سونپا گیا تھا اب اُنھیں اس سے ہٹایا جا رہا ہے کیونکہ اُنھوں نے اس کا حق ادا نہ کیا اور اس نعمت کی قدر نہ پہنچانی۔ ان کے بدلے اب یہ خدمت اُمت مسلمہ کو سونپی جا رہی ہے اور وہی اس فریضہ کو انجام دے گی۔

اس واقعہ کا اثر یہ پڑا کہ بہت سے لوگوں کا جن کے دلوں میں ایمان نے جگہ نہیں پائی تھی پردہ فاش ہو گیا اور اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کام پر سخت نکتہ چینی کی اور یہ واضح ہو گیا کہ ان کا مقام اسلامی جماعت میں کیا ہے؟ اس طرح بہت سے دو دلے مسلمان اسلامی جماعت سے الگ ہو گئے اور بڑی حد تک جماعت ایسے ناکارہ لوگوں سے پاک ہو گئی۔

++

نواں باب

تحریک اسلامی کی مدافعت[1]

مکے میں جب عقبہ کے مقام پر مدینہ کے کچھ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ پیش کش کی تھی کہ آپ اور آپ کے ساتھی مدینہ تشریف لے آئیں، اسی وقت یہ خطرہ کھل کر سامنے آ گیا تھا کہ اس بیعت اور اس پیشکش کی حیثیت دراصل مدینہ والوں کی طرف سے سارے عرب کو ایک چیلنج کی ہے چنانچہ بیعت کرنے والوں میں سے ایک بزرگ عباسؓ بن عبادہ کے یہ الفاظ جو اُنھوں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہے تھے اب تک تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ''جانتے ہو اس شخص سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟......تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو لہٰذا اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمھارے مال تباہی کے اور تمھارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے کہ آج ہی اسے چھوڑ دو کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا اور

---

[1] یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ اسلام میں جنگ محض مدافعت ہی کے لئے ہوتی ہے بلکہ جب دین کا تقاضہ ہوتا ہے تو حق کو خود بڑھ کر بھی باطل کا زور توڑنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی جنگوں کا موقعہ تحریک اسلامی کو بعد کے موقعوں پر پیش آیا جن کا ذکر آگے آئے گا۔

آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تمھارا ارادہ یہ ہے کہ جو بلاوا تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کے باوجود نباہو گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔'' اس موقع پر تمام وفد نے بالاتفاق کہا تھا کہ ''ہم اسے لے کر اپنے اموال کو تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ جب مدینہ والوں کے اس دعویٰ کی جانچ ہونا تھی۔

قریش کے لئے خطرہ:-

مدینہ میں مسلمانوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منتقل ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ اب اسلام کو ایک ٹھکانہ میسر آ گیا تھا اور اب وہ مسلمان جن کی صداقت، صبر اور استقامت کا بار بار امتحان ہو چکا تھا ایک منظّم جماعت کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ قریش کے لئے یہ ایک شدید خطرہ تھا اب اُنھیں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اسلامی جماعت کا اس طرح منظّم ہو جانا دراصل ان کے جاہلی نظام کے لئے موت کا پیام ہے۔ اس کے علاوہ ایک سخت خطرہ اور تھا جس نے اُنھیں انتہائی بے چین کر رکھا تھا۔ مکے والوں کی معاش کا بڑا دارومدار یمن اور شام کی تجارت پر تھا۔ شام کو تجارت کا جو راستہ بحر احمر کے کنارے کنارے جاتا تھا مدینہ عین اس راہ پر تھا۔ مدینے میں مسلمانوں کے طاقت پکڑنے کا مطلب یہ تھا کہ ملک شام سے قریش کی تجارت کا دارومدار یا تو مسلمانوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھنے پر تھا یا پھر اس راستے سے تجارت کا مال صرف اس صورت میں جا سکتا تھا کہ مدینے میں مسلمانوں کی طاقت کو آخری

طور پر کچل ڈالا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ہجرت سے پہلے قریش نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح مدینے میں مسلمان اکٹھے نہ ہوسکیں۔ لیکن جب ان کی تدبیر ناکام ہوگئی تو اب اُنھوں نے یہ طے کیا کہ جس طرح بھی ہوسکے اِس اُبھرتے ہوئے خطرے کو ہمیشہ کے لئے دبا ہی ڈالنا چاہیے۔

قریش کی سازش:-

عبداللہ بن ابی مدینے کا ایک سردار تھا ہجرت سے پہلے مدینے والے اُسے پنا بادشاہ بنانے کی تیاری کر چکے تھے لیکن مدینے کے لوگوں نے جب اسلام قبول کرنا شروع کیا اور مکے سے مسلمان اور آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لے آئے تو یہ اسکیم ٹھپ ہوگئی اور عبداللہ بن ابی کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس موقع پر مکہ والوں نے اُسے ایک خط لکھا کہ ''تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو اپنے یہاں پناہ دی ہے ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم خود اس سے لڑو اور اسے اپنے یہاں سے نکال دو نہیں تو ہم سب تم پر چڑھائی کریں گے تمھارے مردوں کو قتل کریں گے اور تمھاری عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔'' یہ خط عبداللہ بن ابی کی ٹوٹی ہوئی اُمیدوں کے لئے کچھ سہارا بنا لیکن آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بروقت اس کے شر کو روکنے کے لئے اسے سمجھایا کہ ''کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے۔'' چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے اس لئے عبداللہ مجبوراً اپنے برے ارادوں سے باز رہا۔

اسی زمانے میں مدینے کے رئیس سعد بن معاذ عمرہ کے لئے مکہ گئے۔ حرم کے دروازے پر ابوجہل سے ملاقات ہوگئی۔ ابوجہل نے ان سے کہا کہ تم تو

ہمارے دین کے مرتدوں (مسلمانوں) کو پناہ دو اور ہم تمھیں اطمینان کے ساتھ مکے میں طواف کرنے دیں؟ اگر تم امیہ بن خلف کے مہمان نہ ہوتے تو یہاں سے زندہ نہیں جا سکتے تھے۔" یہ سن کر سعد نے جواب میں کہا۔ "خدا کی قسم اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمھیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمھارے لئے اس سے زیادہ شدید ہے یعنی مدینہ پر سے تمھارا راستہ۔" یہ گویا اعلان تھا اس بات کا کہ اگر قریش نے کوئی شرارت کی تو اُنھیں اپنے اس تجارتی راستے کو جو مدینے کے پاس سے گزرتا ہے اپنے لئے بند سمجھنا چاہیے۔

قریش پر دباؤ:-

اس وقت قریش مسلمانوں اور اسلامی تحریک کو مٹا ڈالنے کیلئے جو منصوبے بنا رہے تھے ان کے پیش نظر ان کو نیچا دکھانے اور مجبور کرنے کیلئے مسلمانوں کے سامنے اس سے بہتر کوئی صورت نہ تھی کہ وہ اس راستے پر اپنا قبضہ کریں اور ان کیلئے شام کی تجارت بند کر دیں۔ یہی ایک دباؤ ایسا تھا جس سے مکے کے لوگ مجبور ہو سکتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راہ کے قریب بسنے والے یہودی قبیلوں سے مختلف قسم کے معاہدے کر کے اطمینان کر لیا اور پھر قافلوں کو دھمکی دینے کیلئے کبھی کبھی مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنا شروع کر دیے۔ ان دستوں کے ذریعہ اگرچہ نہ تو کبھی کوئی کشت وخون ہوا اور نہ کبھی کوئی قافلہ لوٹا گیا لیکن ان کو بھیج کر قریش کو صاف صاف آگاہ کر دیا گیا کہ وہ اب جو کچھ بھی قدم اٹھائیں یہ سوچ کر اٹھائیں کہ ہوا کا رخ کدھر ہے اگر وہ مسلمانوں کو تنگ کریں گے تو اُنھیں بھی اپنی تجارت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

حضرمی کا قتل:-

اس درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حالات سے برابر باخبر رہنے کی کوشش فرماتے رہتے تھے تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ قریش کس قسم کے منصوبے بنارہے ہیں۔ رجب ۲ھ کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطن نخلہ کی طرف بھیجا یہ مقام مکے اور طائف کے درمیان واقع تھا۔ آپ نے حضرت عبداللہ کو ایک خط دے کر فرمایا تھا کہ دو دن بعد اسے کھولنا۔ حضرت عبداللہ نے حسب ارشاد خط کھولا تو لکھا تھا کہ ''مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو۔'' اتفاق یہ کہ قریش کے کچھ آدمی شام سے تجارت کا مال لیے آتے تھے۔ حضرت عبداللہ نے ان پر حملہ کیا اور ان میں سے ایک شخص عمر بن الحضرمی مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور مال غنیمت بھی ہاتھ آیا۔ حضرت عبداللہ نے مدینہ آکر یہ واقعہ بیان فرمایا اور غنیمت کا مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت ناخوشی کا اظہار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی۔'' اور غنیمت کا مال قبول کرنے سے انکار فرمادیا۔

اس واقعہ میں قتل ہونے والا اور دونوں گرفتار ہونے والے بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے اور اس بنا پر اس واقعہ نے قریش کو بہت زیادہ مشتعل کردیا اور خون کا بدلہ لینے کی ایک بنیاد قائم ہوگئی۔

غزوۂ بدر

یہ حالات تھے کہ شعبان ۲ھ (فروری یا مارچ ۶۲۳ء) میں قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ جس کے ساتھ تقریباً پچاس ہزار اشرفی کا مال تھا۔ شام سے واپس آتے ہوئے اس علاقے کے قریب آیا جو مسلمانوں کی زد میں تھا۔ قافلے کے ساتھ تیس چالیس محافظوں سے زیادہ لوگ نہ تھے اور اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں مدینے کے قریب والے علاقے میں پہنچنے کے بعد مسلمان اس پر حملہ نہ کر دیں۔ قافلہ کا سردار ابوسفیان تھا اس نے اس خطرے کو محسوس کر کے ایک شخص کو مکے دوڑا دیا کہ وہ وہاں سے مدد لے کر آئے۔ چنانچہ اس شخص نے مکے میں آکر ایک شور مچا دیا کہ قافلے کو مسلمان لوٹے لے رہے ہیں۔ دوڑو مدد کیلئے دوڑو۔'' قافلے میں جو مال تھا اس سے بہت سے لوگوں کا تعلق تھا پھر یہ ایک قومی مسئلہ بن گیا۔ چنانچہ اس پکار پر قریش کے تمام بڑے بڑے سردار لڑائی کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور تقریباً ایک ہزار جوشیلے جوانوں کی ایک فوج تیار ہوگئی۔ یہ فوج انتہائی جوش اور شان وشوکت کے ساتھ مکے سے اس ارادہ کے ساتھ روانہ ہوئی کہ اب مسلمانوں کا خاتمہ کر ڈالنا چاہیے تا کہ یہ روز روز کی جھنجھٹ ہی مٹ جائے۔ ایک طرف مال کے بچانے کی خواہش دوسری طرف پرانی دشمنی اور تعصب کا جوش، غرض یہ کہ لوگ انتہائی دیوانگی اور شان کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کیلئے روانہ ہوئے۔

قریش کی چڑھائی:-

ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان حالات کی اطلاعات پہنچ رہی تھی۔ آپ

نے محسوس فرمایا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اگر اس وقت قریش کو اپنے ارادوں میں کامیابی ہوگئی اور اُنھوں نے مسلمانوں کی اس نئی جماعت کو نیچا دکھا دیا تو پھر اسلامی تحریک کے پنپنے کا سوال انتہائی مشکل ہو جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ اسلام کی آواز ہمیشہ کے لئے دب جائے۔ مدینہ میں آئے ہوئے ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے۔ مہاجرین اپنا سب کچھ مکے میں چھوڑ چھاڑ کر آئے تھے اور خالی ہاتھ تھے۔ انصار لڑائی کے معاملے میں ناتجربہ کار تھے، یہودیوں کے بھی بہت سے قبیلے مخالفت پر آمادہ تھے۔ خود مدینے میں منافقوں اور مشرکوں کی موجودگی ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ایسے حالات میں اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر قریش مدینہ پر چڑھ آئے تو ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کا خاتمہ ہو جائے اور اگر وہ حملہ نہ بھی کریں بلکہ اپنے زور سے قافلے کو بچا کر نکال لے جائیں تو بھی مسلمانوں کی ایسی ہوا اکھڑ جائے گی کہ پھر آئندہ آس پاس کے قبیلوں کو مسلمانوں کے دبا لینے میں کوئی اندیشہ باقی نہ رہ جائے گا اور وہ قریش کے اشاروں پر مسلمانوں کو پریشان کرنا شروع کر دیں گے۔ ادھر مدینہ کے یہودی، منافقین اور مشرکین بھی سر اٹھائیں گے اور مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیں گے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ اس وقت جو طاقت بھی میسر ہے اسے لے کر میدان میں نکلیں۔ اور یہ فیصلہ ہو جائے کہ جینے کا حق کسے ہے اور کسے نہیں۔

مسلمانوں کی تیاری:-

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا

اور پورے حالات ان کے سامنے صاف صاف رکھ دیے کہ ایک طرف مدینے
کے شمال میں تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف جنوب میں قریش کا لشکر چلا آرہا
ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تمھیں مل جائے گا۔ بتاؤ تم
کس کے مقابلے پر چلنا چاہتے ہو۔ جواب میں بہت سے صحابہ نے یہی خواہش
ظاہر کی کہ قافلے پر حملہ کیا جائے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تو کچھ اور
ہی تھا اس لئے آپ نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اس پر مہاجرین میں سے ایک
صحابی مقداد بن عمروؓ نے اٹھ کر فرمایا ''یارسول اللہ! جدھر آپ کو آپ کا رب حکم
دے رہا ہے اس طرف چلئے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح
یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمھارا خدا دونوں لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں [1]''
مگر اس مسئلے میں آخری رائے قائم کرنے سے پہلے انصار کی رائے معلوم کرنا
ضروری تھا اس لئے حضورؐ نے ان لوگوں کو براہ راست مخاطب کرکے اپنے
سوال کو دہرایا۔ اس پر حضرت سعد بن معاذؓ اٹھے اور فرمایا۔ ''یارسول اللہؐ! ہم
آپ پر ایمان لائے ہیں آپ کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اس بات کی گواہی دے
چکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے، آپ کی اطاعت کا پختہ عہد باندھ
چکے ہیں، پس اے رسول اللہؐ! آپ نے جو کچھ ارادہ فرمایا ہے اُسے کر
گذرئیے، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اگر
آپ ہمیں لے کر سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم آپ کے ساتھ
کودیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم جنگ میں ثابت قدم

---

[1] یہ بات بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی۔

رہیں گے۔ مقابلے میں سچی جاں نثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں کہ اللہ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھوادے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیں۔''

ان تقریروں کے بعد فیصلہ ہو گیا کہ قافلے کے بجائے لشکر ہی کے مقابلے کے لئے چلنا ہے لیکن یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ مسلمانوں کی جماعت قریش کے مقابلے میں بہت کمزور تھی لڑائی کے قابل لوگوں کی تعداد تین سو سے کچھ ہی زیادہ تھی جن میں سے دو تین کے پاس گھوڑے تھے اور اونٹ بھی ستر سے زیادہ نہ تھے۔ لڑائی کا سامان بھی ناکافی تھا صرف ساٹھ آدمیوں کے پاس زرہیں تھیں۔ اسی لئے مسلمانوں میں تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر لوگ دلوں میں ڈر رہے تھے اور اُنھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا جانتے بوجھتے موت کے منہ میں جا رہے ہیں سورۂ انفال کی یہ آیات اسی نقشے کو پیش کرتی ہیں۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ص وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ط ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ج ۝

ترجمہ: --جس طرح (اے نبی!) تیرا رب تجھے حق کے ساتھ گھر سے نکال لایا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ سخت ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملے میں

تجھ سے جھگڑ رہے تھے حالانکہ وہ صاف صاف ظاہر ہو چکا تھا ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔

یاد کرو وہ موقع، جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمھیں مل جائے گا تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمھیں ملے مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تا کہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے یہ بات مجرموں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ (سورہ انفال رکوع (۱) پارہ ۹)

مدینہ سے مسلمانوں کا کوچ:۔

باوجود اس بے سروسامانی کے ۱۲ر رمضان ۲ھ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھروسے پر تقریباً ۳۰۰ مسلمانوں کو ساتھ لے کر مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے سیدھی جنوب مغرب کی راہ لی۔ جدھر سے قریش کا لشکر آ رہا تھا ۱۶ر رمضان کو بدر کے قریب پہنچے۔ بدر ایک گاؤں کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے جنوب مغرب کی طرف تقریباً ۸۰ر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں پہنچنے پر پتہ چلا کہ قریش کا لشکر وادی کے دوسرے سرے تک آ پہنچا ہے لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بموجب یہاں ہی پڑاؤ ڈال دیا گیا۔

ادھر قریش کا حال سنیے۔ یہ لوگ بڑے ساز وسامان سے نکلے تھے۔ ایک ہزار سے زیادہ سپاہی تھے اور تقریباً سو (۱۰۰) سردار شریک تھے سپاہیوں کے لئے رسد کا بہت اچھا انتظام تھا۔ عتبہ بن ربیعہ فوج کا سپہ سالار تھا۔

بدر کے قریب پہنچ کر قریش کے لشکر کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا تجارتی قافلہ

مسلمانوں کی زد سے باہر ہے۔ اس پر قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا کہ ''اب لڑنا ضروری نہیں''، لیکن ابو جہل نہ مانا۔ زہرہ اور عدی کے لوگ اسی بنا پر واپس چلے گئے اور باقی فوج آگے بڑھی۔

لڑائی کا میدان :-

لڑائی کے میدان میں جس حصے پر قریش قابض تھے وہ موقع کے لحاظ سے بہتر تھا زمین پختہ تھی لیکن جس پر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تھا وہ ریتیلی تھی اور سپاہیوں کے پاؤں دھنستے تھے۔ رات کو سب سپاہیوں نے آرام کیا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام رات دعا میں مصروف رہے اور ۱۷رمضان کو نماز فجر کے بعد آپ نے جہاد پر وعظ فرمایا اور اصول جنگ کے لحاظ سے فوجوں کی صفیں درست کیں۔ روزے اسی سال فرض ہوئے تھے اور یہ عجیب آزمائش تھی کہ مسلمانوں کو پہلے ہی رمضان میں اپنے سے تین گنی فوج کے مقابلے میں جنگ کے لئے تیار ہونا پڑا۔ اسی رات کو دو باتیں ایسی ہوئیں جو اللہ تعالیٰ کے خصوصی کرم کا مظہر تھیں ایک تو یہ کہ مسلمان کو سکون کے ساتھ نیند آئی اور وہ صبح تازہ دم ہو کر اٹھے۔ دوسرے اسی رات کو بارش ہو گئی۔ بارش ہو جانے سے ریتیلی زمین سخت ہو گئی اور مسلمانوں کے لئے میدان اچھا ہو گیا۔ اس کے برخلاف اسی بارش سے اس حصے میں کیچڑ ہو گئی جس میں قریش کا لشکر تھا ان کے پاؤں دھنسنے لگے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے لئے تالابوں میں پانی بھی جمع ہو گیا جس سے اُنھوں نے غسل کیا اور وضو وغیرہ کا آرام ہو گیا۔ دل کا ہراس اور گھبراہٹ دور ہو گئی اور مسلمان پورے اطمینان کے ساتھ مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔

جنگ کی ابتداء:-

جس وقت دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو یہ ایک عجیب منظر تھا ایک طرف اللہ پر ایمان رکھنے والے اور اس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی اور اطاعت قبول نہ کرنے والے ۳۱۳ مسلمان تھے جن کے پاس لڑائی کا سامان بھی ٹھیک سے نہیں تھا اور دوسری طرف ساز وسامان سے لیس ایک ہزار سے زائد کافروں کا لشکر تھا جو اس فیصلے کے ساتھ آئے تھے کہ توحید کی اس آواز کو ہمیشہ کے لئے دبا کر ہی دم لیں گے اس موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے آگے دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے اور انتہائی عاجزی اور زاری کے ساتھ دعا فرمائی کہ ''اے اللہ! یہ قریش ہیں، اپنے سامانِ غرور کے ساتھ آئے ہیں تا کہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کریں۔ اے اللہ! بس اب تیری وہ مدد آجائے جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ اے اللہ! اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت کہیں نہ ہوگی۔''

اس جنگ میں سب سے زیادہ سخت امتحان مہاجرین کا تھا۔ ان کے اپنے بھائی، بیٹے اور رشتے دار مقابلے میں تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں اور کسی کا بھائی اسی کی تلوار کی زد میں تھا اور ان کو اپنے ہاتھوں سے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کاٹنا پڑ رہا تھا۔ اس سخت امتحان میں وہی لوگ ٹھہر سکتے تھے۔ جنھوں نے واقعی سچے دل سے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ جن رشتوں کو اس نے جوڑا ہے وہ بس ان ہی کو جوڑیں گے اور جن کو اس نے کاٹنے کا حکم دیا ہے ان کو کاٹ پھینکیں گے چاہے وہ رشتے ان کو کتنے ہی عزیز کیوں نہ ہو لیکن ساتھ ہی

انصار کا امتحان بھی کچھ کم سخت نہ تھا۔ اب تک تو عرب کے کفار اور مکے کے مشرکین کی نظر میں ان کا ''جرم'' بس اتنا ہی تھا کہ اُنھوں نے ان کے دشمنوں یعنی مسلمانوں کو پناہ دی تھی لیکن اب تو وہ کھل کر اسلام کی اعانت میں کفار سے جنگ کرنے کیلئے نکل آئے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ اُنھوں نے اپنی بستی مدینے کے خلاف سارے عرب کو دشمن بنالیا تھا۔ حالانکہ مدینے کی آبادی ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ ہمت وہی لوگ کر سکتے تھے جن کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور آخرت کے پختہ ایمان نے پورا پورا گھر کرلیا ہو ورنہ اس طرح اپنے مال وجائداد اور اپنے بیوی بچوں کو کون سارے عرب کی دشمنی کے خطرے میں ڈال سکتا تھا۔

قریش کی شکست:-

ایمان کا یہی وہ مقام ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد اللہ کی مدد آتی ہے اور ضرور آتی ہے چنانچہ بدر کے میدان میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کمزور ۳۱۳ مسلمانوں کی مدد فرمائی اور ان کے مقابلے میں ایک ہزار سے زائد کے لشکر کو ایسی شکست ہوئی کہ گویا قریش کی ساری قوت ہی ٹوٹ گئی۔ اس جنگ میں قریش کے تقریباً ۷۰ آدمی مارے گئے اور اتنے ہی قید ہوئے۔ ان مارے جانے والوں میں ان کے بڑے بڑے سردار تقریباً سب ختم ہو گئے ان میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، زمعہ، عاص، امیہ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں ان سرداروں کی موت نے قریش کی کمر توڑ دی مسلمانوں میں سے چھ مہاجر اور آٹھ انصار نے شہادت پائی۔

جنگ میں جو لوگ قید ہو کر آئے وہ دو دو چار چار کر کے صحابہ میں تقسیم کر دیے گئے اور ہدایت کر دی گئی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ چنانچہ صحابہ نے ان کو ایسے آرام سے رکھا کہ بہت سے موقعوں پر خود تکلیف اٹھائی لیکن ان کو تکلیف نہ ہونے دی۔ اس اچھے سلوک نے ان لوگوں کے دلوں کو اسلام کے لئے نرم کر دیا اور یہی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ بعد کو ان قیدیوں میں سے بہت سے لوگ فدیہ (بدلے میں کچھ مال) دے کر رہا ہو گئے۔ جو غریب تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہ اس شرط پر رہا کر دیے گئے کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔

جنگ بدر کے نتائج اور اثرات:-

بدر کی لڑائی اپنے نتائج اور اثرات کے لحاظ سے بہت اہم تھی۔ یہ لڑائی دراصل اس عذاب الٰہی کی پہلی قسط تھی جو اسلام کی دعوت قبول نہ کرنے کی سزا میں کفار مکہ کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔ اس لڑائی نے یہ ظاہر کر دیا کہ اسلام اور کفر میں دراصل جینے کا حق کسے ہے اور آئندہ حالات کا رخ کیا ہوگا۔ اس اعتبار سے اسلامی تاریخ کا یہ پہلا معرکہ بہت عظیم الشان معرکہ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی سورۂ انفال میں اس معرکہ پر بہت تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے لیکن یہ تبصرہ ان تمام تبصروں سے بالکل مختلف ہے جو دنیوی بادشاہ اور جنرل کسی لڑائی کے جیتنے کے بعد عام طور سے کیا کرتے ہیں۔

اس تبصرہ کی خصوصیات ایسی ہیں کہ اُن پر ذرا تفصیل سے نظر ڈالنا ضروری ہے اس سے اسلامی تحریک کے مزاج اور مسلمانوں کی تربیت کے پروگرام پر روشنی پڑتی ہے۔

جنگ بدر پر تبصرہ اور مومنین کی تربیت:-

(۱) جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، اسلام سے پہلے جنگ عربوں کا بہت دل پسند مشغلہ تھا۔ جنگ میں جو مال ہاتھ آتا تھا (مال غنیمت) اس سے اُنھیں بے حد دلچسپی تھی اور بسا اوقات اسی مال کی کشش ان کی لڑائی کا سبب بن جاتی تھی لیکن اسلام کی نظر میں جنگ کا مقصد مال و دولت سے بہت بلند تھا اور اس مقصد کو پورے طور پر دلوں میں بٹھا دینا بہت ضروری تھا۔ بدر کی لڑائی وہ پہلی لڑائی ہے جس میں مسلمانوں کو امتحان دینا پڑا کہ آیا ان کے دلوں میں اسلامی جنگ کے اصول اور اخلاق پورے طور پر بیٹھ چکے ہیں یا ابھی تک غیر اسلامی لڑائیوں کے تصورات دلوں میں کسی نہ کسی درجے میں موجود ہیں۔

بدر کی لڑائی میں جن لوگوں کے ہاتھ کفار کا جو مال آیا وہ اپنے پرانے طریقے کے مطابق اپنی ہی ملکیت سمجھ بیٹھے اور جو لوگ کفار کا پیچھا کرنے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرنے میں مصروف رہے ان کو کچھ نہ ملا۔ اس طرح آپس میں کچھ بدمزگی سی پیدا ہونے لگی یہی موقعہ تھا کہ اب تحریک اسلامی کے داعیوں کی مناسب تربیت کی جائے۔ چنانچہ اُنھیں سب سے پہلے صاف صاف یہ بتا دیا گیا کہ مال غنیمت دراصل جنگ کا بدلہ نہیں ہے۔ اُسے تو ''انفال'' سمجھو یعنی مالک کی طرف سے ایک عطیہ اور انعام، جو اصل اُجرت کے علاوہ دیا جاتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کا اصل بدلہ تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا یہاں جو کچھ مل جاتا ہے وہ کسی کا حق نہیں ہے بلکہ اللہ کی ایک مزید بخشش ہے اس لئے اس بخشش کے بارے میں استحقاق کا کوئی سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ تو اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ وہ جس طرح چاہے اُسے تقسیم کرے۔ چنانچہ آگے چل کر اس کی تقسیم کا اصول بھی بنا دیا۔ اس طرح جنگ کے سلسلے میں ایک بہت بڑی اخلاقی اصلاح کر دی گئی مسلمان کو ہمیشہ کے لئے بتا دیا گیا کہ وہ دنیا کے فائدے بٹورنے کے لئے کبھی تلوار نہیں اٹھاتا ہے بلکہ دنیا کے اخلاقی بگاڑ کو ٹھیک کرنے کے لئے اور اللہ کے بندوں کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے وہ مجبوراً اس وقت طاقت کا استعمال کرتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ مخالف طاقتیں اس کی آواز کو دبا دینے کے لئے طاقت استعمال کرنے پر اتر آئی ہیں اور اُنھوں نے دعوت تبلیغ کے ذریعہ اصلاح کو ناممکن بنا دیا ہے اس لئے مسلمان کی نظر ہمیشہ اس اصلاح پر رہنی چاہیے جس کے لئے اس نے بیڑا اٹھایا ہے نہ کہ ان مادی فوائد پر جو اس مقصد کے لئے کوشش کرنے میں حاصل ہو ہی جاتے ہیں۔

۲- اسلامی نظام میں اطاعت امر کی اہمیت ایسی ہی سمجھنا چاہیے جیسے کسی جسم میں روح اسی لئے مکمل اور بے چون وچرا اطاعت پر دلوں کو آمادہ کرنے کے لئے بار بار توجہ دی گئی چنانچہ اس جنگ کے موقع پر بھی مال غنیمت کے سلسلے میں سب سے پہلے مکمل اطاعت کا مطالبہ کیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ یہ سب کچھ خدا اور اس کے رسول کا ہے۔ اس بارے میں وہ جو کچھ فیصلہ فرمائیں اس پر دلوں کو راضی ہونا چاہیے۔

۳- عام تحریکوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیرووں اور کارکنوں کے دل بڑھانے کے لئے ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں اور اس طرح شہرت اور

ناموری حاصل کرنے کے جذبہ کو اُبھار کر لوگوں کو ایثار اور قربانیوں کے لئے تیار کرتے ہیں چنانچہ بڑے معرکوں یا بڑے کارناموں کے بعد وہ اپنے جاں بازوں اور کارکنوں کو خطابات اور تمغے دیتے ہیں۔ انعامات تقسیم کرتے ہیں اور طرح طرح سے ان کو اونچا اٹھانے کا ایسا انتظام کرتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ اپنی کارگزاریوں کا بدلہ پاکر مطمئن ہوسکیں اور آئندہ کے لئے اور زیادہ جانبازی دکھاسکیں اور دوسری طرف دوسرے لوگوں کے دلوں میں ان ہی کی طرح اونچا مقام حاصل کرنے کی آرزو پیدا ہوسکے۔ اسلامی تحریک کا مزاج اس کے بالکل خلاف ہے۔ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے ۳۱۳ سپاہیوں نے ایک ہزار سے زائد لشکر کا منہ پھیر دیا تھا اور باوجود اپنی بے سروسامانی کے اپنے سے کئی گنا زیادہ مقابل قوت کا خاتمہ کردیا تھا۔ لیکن ان سے یہی کہا گیا کہ وہ اس واقعہ کو اپنی بہادری یا اپنی کارگزاری نہ سمجھیں یہ محض اللہ کا فضل تھا صرف اس کی رحمت اور فضل کا یہ نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے اپنے دشمن کو مار بھگایا۔ اُنھیں کبھی اپنے وسائل اور قوت پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے ان کی اصل طاقت یہ ہے کہ وہ اللہ پر بھروسہ رکھیں اور ہمیشہ اس کے فضل کے سہارے میدان میں اتریں عین لڑائی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر ریت ہاتھ میں لے کر شَاهَتُ الْوُجُوْهُ (چہرے بگڑ جائیں) فرماتے ہوئے اُسے کفار کی طرف پھینکا تھا اور اس کے بعد ہی مسلمان یکبارگی کافروں پر ٹوٹ پڑے اور کافروں کے پیر اکھڑ گئے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جسے دوسرے لوگ اپنی کرامت بتا کر جو کچھ بھی فخر کرتے، تھوڑا تھا اور اگر وہ خود ایسا نہ کرتے تو ان کے پیرو معلوم نہیں اس کی بنیاد پر کیسی کچھ

باتیں بناتے لیکن خود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ ''تم نے اُنھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا'' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا کہ ''تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا'' اور یہ کہ ''یہ تو سب کچھ اس لئے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گذار دے''۔ (سورہ:انفال آیت ۱۷)

مسلمانوں کو اچھی طرح بتا دیا کہ دراصل سارے کاموں کا انتظام اللہ کے ہاتھ میں ہے جو کچھ ہوتا ہے اس کے حکم اور ارادے سے ہوتا ہے مومن کا کام اللہ پر بھروسہ کرنا اور ہر حال میں خدا اور رسول کی پوری پوری اطاعت کرنا ہے اسی میں ان کا امتحان ہے۔

۴-اسلامی تحریک میں جہاد ہی وہ آخری امتحان ہے جس میں تحریک کے ہر علم بردار کی پوری پوری جانچ ہو جاتی ہے۔ جب کفر اور اسلام کی کشمکش اس درجے میں پہنچ جائے کہ مومن کو دعوت وتبلیغ کے کام کو باقی رکھنے کے لئے مجبوراً میدان میں اترنا ہی پڑے تو پھر میدان سے واپسی اس کے لئے ممکن نہیں رہتی۔ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہوئے میدان سے بھاگنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یا تو:-

ا-مومن کو اپنی جان اس مقصد سے زیادہ عزیز ہے جس کے لئے وہ لڑائی لڑی جا رہی ہے۔یا

ب-اس کا یہ ایمان کمزور ہے کہ دراصل موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جب تک اس کا حکم نہ ہو موت آ نہیں سکتی اور جب اس کا حکم آ جائے تو پھر

موت ٹل نہیں سکتی۔ یا

ج-اس کے دل میں ابھی اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کے علاوہ کچھ اور آرزوئیں بھی پرورش پا رہی ہیں اور دراصل ابھی اس نے اپنے آپ کو خدا کے دین کے قائم کرنے کے لئے بالکل وقف نہیں کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس ایمان کے ساتھ ان میں سے کوئی بات شامل ہے اُسے کس طرح پورا ایمان کہا جا سکتا ہے، اسی لئے اس پہلی جنگ کے موقع پر مسلمانوں کو صاف صاف بتا دیا کہ جنگ سے منہ موڑنا مسلمان کا کام نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین گناہ ایسے ہیں جن کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دے سکتی۔ ایک شرک، دوسرے والدین کی حق تلفی، اور تیسرے اللہ کی راہ میں لڑی جانے والی لڑائی سے منہ موڑ کر بھاگنا۔

۵-اللہ کی راہ میں پیش قدمی کرنے میں آدمی اُس وقت بھی سست ہو جاتا ہے جب دنیاوی تعلقات سے اس کی دلچسپی ایک جائز حد سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ مال اور اولاد اس کی راہ میں بڑی رکاوٹیں بن جاتی ہیں۔ چنانچہ اس موقعہ پر بھی اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کی صحیح حیثیت سے مسلمانوں کو باخبر کیا فرمایا کہ "جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد حقیقت میں تمھاری آزمائش کا سامان ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لئے بہت کچھ ہے (سورۂ انفال آیت ۲۸) مال و دولت دے کر اللہ تعالیٰ مومن کی آزمائش کرتا ہے کہ آیا وہ اس کو صحیح مصرف میں لاتا ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ کہیں مال کی محبت دل میں اتنی تو نہیں بڑھ جاتی کہ جب اللہ کی راہ میں اس کی بازی لگانے کا وقت آ جائے تو دل تنگ ہو جائے یا اس کی

خاطر حق کی جدوجہد میں کچھ سستی آجائے۔ اسی طرح اولاد بھی انسان کے امتحان کا دوہرا پرچہ ہے ایک طرف تو مومن کو ان کے جائز حقوق اس طرح ادا کرنا ہیں کہ وہ اُنھیں اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت کی راہ پر لگانے کی پوری کوشش کرے اور دوسری طرف یہ دیکھنا ہے کہ کہیں ان کی وہ فطری محبت جو اللہ نے ہر انسان کے دل میں رکھ دی ہے بڑھ کر اتنی حاوی تو نہیں ہو جاتی کہ اللہ کی راہ پر چلنے کے لئے اس کے قدموں کو بوجھل کر دے۔ مال اور اولاد کے سلسلے میں یہی دوہرا امتحان ہے جس کے لئے ہر مومن کو تیار رہنا چاہیے۔

(۶) صبر، ہر تحریک کی جان ہے اور اسلامی تحریک کے لئے تو یہ صفت ایسی ہی ضروری ہے جیسے جسم کے لئے روح ضروری ہے۔ مکے میں مسلمان جن حالات سے گذر رہے تھے وہاں بھی اس صفت کو زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی طرف توجہ دی گئی تھی لیکن وہاں صورت حال یہ تھی کہ سوائے مظالم برداشت کرنے کے اور کوئی صورت مسلمانوں کے سامنے نہیں تھی۔ اب تحریک دوسرے مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ اب اس کا اندیشہ بھی تھا کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں کسی پر زیادتی ہو جائے۔ اس لئے ان بدلے ہوئے حالات میں بھی اس صفت کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کی تاکید کی گئی۔ فرمایا: اے ایمان لانے والو! جب کسی گروہ سے تمھارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو امید ہے کہ تمھیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں کہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

(سورۂ انفال آیت ۴۵، ۴۶)

یہاں صبر کے مفہوم میں یہ سب باتیں شامل ہیں کہ:۔

۱-اپنے جذبات اور خواہشات کو قابو میں رکھا جائے۔

۲-جلد بازی اور گھبراہٹ اور ہراس سے بچا جائے۔

۳-کسی لالچ یا نامناسب جوش کو قریب نہ آنے دیا جائے، ہر کام ٹھنڈے دل اور جچے تلے فیصلوں کے ساتھ کیا جائے۔

۴-خطرے اور مشکلیں سامنے آئیں تو قدم ڈگمگا نہ جائیں۔

۵-اشتعال اور غیظ وغضب کا شکار ہو کر کوئی غلط کام نہ کر ڈالیں۔

۶-مصائب کا حملہ ہو اور حالات بگڑتے نظر آئیں تو بے چینی اور گھبراہٹ کی وجہ سے حواس پریشان نہ ہو جائیں۔

۷-مقصد کے حاصل کر لینے کا شوق اتنا نہ بڑھ جائے کہ جلد بازی میں کسی ناقص تدبیر پر عمل کر ڈالا جائے۔

۸-دنیاوی فائدے اور لالچ نفس کو اتنا نہ لبھالیں کہ اس کے مقابلے میں کمزوری دکھا کر ان فائدوں کی طرف کھنچ جائیں اب ان بدلے ہوئے حالات میں مومنوں کو اپنے صبر کا امتحان کچھ دوسرے طریقوں سے بھی دینا تھا۔

۹-مقصد کی محبت کا غلبہ کبھی کبھی اتنا بڑھ جاتا ہے کہ انسان اس کے مقابلے میں حق اور انصاف کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھتا اور سمجھتا ہے کہ مقصد کی خاطر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اسلامی تحریک جو سراسر حق کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اپنے پیرووں کو کسی موقع پر بھی حق اور انصاف سے قدم ہٹانے نہیں دیتی۔
چنانچہ کفر اور اسلام کی اس اہم کشمکش کے موقع پر دوسری اخلاقی اور تربیتی ہدایات

1

کے ساتھ مخالفین سے سیاسی معاہدوں کے بارے میں بھی مسلمانوں کو ایسی ہدایات دی گئیں جو سراسر انصاف اور حق پر مبنی تھیں۔ان ہدایات کی روح یہ ہے کہ مسلمان کسی حال میں بھی فتح اور شکست اور مادی فائدوں کو معیار بنا کر معاہدوں کی خلاف ورزی نہ کریں، اللہ پر بھروسہ رکھیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ معاہدوں کا پاس کریں چاہے اس کی وجہ سے اُنھیں خود اپنے بھائی مسلمانوں کی اعانت سے ہی کیوں نہ ہاتھ اٹھانا پڑے۔

یہ ہیں اس تبصرے کی چند موٹی موٹی خصوصیات جو بدر کی لڑائی کے بعد قرآن پاک میں اس فیصلہ کن جنگ کے بارے میں کیا گیا ہے۔ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلامی تحریک دنیا کی تمام دوسری تحریکوں کے مقابلے میں کس درجہ ممتاز ہے اور وہ اپنے پیروؤں کی تربیت کس انداز پر کرتی ہے۔

غزوۂ احد

اسباب:-

بدر کی لڑائی میں اگرچہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تھی لیکن اس جنگ کا مطلب یہ تھا کہ گویا مسلمانوں نے بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارے تھے۔بدر کی لڑائی پہلی لڑائی تھی جس میں مسلمانوں نے کفار کا مقابلہ ڈٹ کر کیا اور کفار کو شکست کھا کر واپس جانا پڑا۔اس واقعہ نے سارے عرب کو مسلمانوں کے خلاف چوکنا کر دیا تھا اور جو لوگ اس نئی تحریک کے دشمن تھے وہ تو اس واقعہ کے بعد اور زیادہ بھڑک گئے تھے پھر ادھر بدر کی لڑائی میں مکے کے جو سردار مارے گئے تھے

ان کے خون کا بدلہ لینے کے لئے ہزاروں دل بے چین ہو گئے تھے۔ عرب میں کسی ایک شخص کا خون اکثر پشتوں تک لڑائی کا سبب بنا رہتا تھا اور یہاں تو ایسے بہت سے لوگ مارے گئے تھے جن کے خون کی قیمت سیکڑوں لڑائیوں سے بھی ادا نہ ہو سکتی تھی۔۔ ہر طرف طوفان کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ یہود کے وہ قبیلے جن سے اس سے پہلے معاہدے ہو چکے تھے اُنھوں نے بھی اُن معاہدوں کا کوئی پاس اور لحاظ نہیں کیا اور باوجود اس کے کہ ان لوگوں کو خدا، رسالت، آخرت اور کتاب پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے کے لحاظ سے مسلمانوں سے زیادہ قریب ہونا چاہیے تھا لیکن ان کی ہمدردیاں ایک دم قریش کے مشرکین کے ساتھ وابستہ ہو گئیں اور اُنھوں نے کھلم کھلا مشرکوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لئے اُبھارنا شروع کر دیا خصوصاً بنی نضیر کا ایک سردار کعب بن اشرف تو اس معاملے میں انتہا سے زیادہ کمینہ پن اور اندھی دشمنی پر اُتر آیا۔ چنانچہ یہ اندازہ ہو گیا کہ یہود نہ تو پڑوسی ہونے کا کوئی لحاظ کریں گے اور نہ ان معاہدوں کا کوئی پاس کریں گے جو اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے تھے۔

اِن حالات میں مدینے کی چھوٹی سی بستی چاروں طرف سے خطرے میں گھر گئی تھی نیز اندرونی طور پر بھی مسلمانوں کی حالت اچھی نہ تھی۔ ان کی مالی حالت ایک تو یوں ہی کمزور تھی اب جنگ کے بعد تو اور بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

مکے کے مشرکین کے دلوں میں ایک تو یوں ہی مسلمانوں سے بدلہ لینے کی آگ بھڑک رہی تھی چنانچہ ان کے کتنے ہی بڑے بڑے سرداروں نے بدلہ لینے

کی قسمیں کھا رکھی تھیں۔ ہر قبیلہ جوش اور غصے سے بھرا ہوا تھا کہ ان حالات میں یہود کی طرف سے مکے والوں کو جنگ پر اُبھارنے کی کوششوں نے آگ پر تیل ڈالنے کا کام کیا اور ابھی بدر کی لڑائی کو مشکل سے سال بھر ہی گذرا تھا کہ یہ خبریں مدینہ پہنچنے لگیں کہ مکے کے مشرکین ایک بہت زبردست لشکر لے کر مدینہ پر حملے کے لئے بالکل تیار ہو چکے ہیں۔

قریش کی پیش قدمی:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال ۳ھ کے پہلے ہفتہ میں دو صاحبان کو صحیح خبر لانے کے لئے روانہ کیا۔ اُنھوں نے آکر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر تو مدینہ کے قریب ہی آ گیا ہے اور مدینے کی ایک چراگاہ ان کے گھوڑوں نے صاف بھی کر ڈالی ہے۔ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کیا لشکر کا مقابلہ مدینے میں ٹھہر کر کیا جائے یا باہر نکل کر جنگ کی جائے؟ بعض صحابہ کی رائے تھی کہ مقابلہ مدینے میں ہی کیا جائے لیکن کچھ نوجوان جو شہادت کے شوق سے بے تاب تھے اور جنھیں بدر کی لڑائی میں لڑنے کا موقع نہ ملا تھا اس پر مصر تھے کہ نہیں مقابلہ باہر میدان میں نکل کر کیا جائے۔ آخر کار ان کے اصرار کو دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ فرمایا کہ باہر نکل کر جنگ کی جائے۔

منافقوں کا دھوکہ:-

قریش نے مدینہ کے قریب پہنچ کر احد کی پہاڑی پر اپنا پڑاؤ ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ایک دن بعد جمعہ کی نماز پڑھ کر ایک ہزار صحابہ کے

ساتھ شہر سے روانہ ہوئے ان میں عبداللہ ابن ابی بھی تھا جو اگر چہ بظاہر مسلمان ہو چکا تھا لیکن دراصل وہ مسلمانوں کا دشمن تھا اور آخر وقت تک منافق ہی رہا۔ یہ بھی مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ اس کا اثر ماننے والے اور بھی بہت سے منافق مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے کچھ دور جا کر عبداللہ ابن ابی اپنے ساتھ تین سو لوگوں کو توڑ کر الگ ہو گیا اور اب صرف ۷۰۰ صحابہ باقی رہ گئے۔ ایسے نازک موقع پر اس کی یہ حرکت ایک بہت سخت نفسیاتی حربہ تھا لیکن جن مسلمانوں کے دل اللہ پر ایمان، آخرت کے یقین اور راہ حق میں شہید ہونے کے شوق سے پُر تھے ان پر اس واقعہ کا کوئی ناگوار اثر نہیں ہوا۔ اور اب یہ بچے ہوئے مسلمان ہی اللہ کے بھروسے پر آگے بڑھے۔

نوجوانوں کا جوش:-

اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیا اور جو کمسن تھے اُنھیں واپس فرمادیا۔ ان نوجوانوں میں رافع اور سمرہ نامی دو نوعمر بھی تھے۔ نوعمروں کو جب فوج سے الگ کیا جانے لگا تو رافع اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے تاکہ قد میں کچھ اونچے دکھائی دینے لگیں اور لے لئے جائیں۔ ان کی یہ ترکیب چل گئی لیکن سمرہ کو شرکت کی اجازت نہ ملی تو اس پر اُنھوں نے کہا کہ جب رافع لیے گئے ہیں تو مجھے بھی اجازت ملنا چاہیے میں تو ان کو کُشتی میں پچھاڑ لیتا ہوں چنانچہ ان کے دعویٰ کے ثبوت کیلئے دونوں میں کُشتی کرائی گئی اور جب اُنھوں نے رافع کو پچھاڑ لیا تو وہ بھی فوج میں لے لئے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا کس درجہ جذبہ موجود تھا۔

فوج کی ترتیب:۔

احد کا پہاڑ مدینہ سے تقریباً ۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج کو اس طرح لگایا کہ پہاڑ پشت پر تھا اور قریش کا لشکر سامنے پشت کی طرف صرف ایک درّہ ایسا تھا جس سے پیچھے کی طرف سے حملہ ہونے کا ڈر تھا۔ وہاں آپ نے عبداللہ بن جبیر کو پچاس تیر انداز دے کر مقرر کر دیا اور ہدایت فرمادی کہ ''کسی کو اس درّے کے راستے سے آنے نہ دینا اور تم یہاں سے کسی حال میں نہ ہٹنا۔ اگر تم دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچے لیے جاتے ہیں تب بھی تم اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔''

قریش کا سازوسامان:۔

قریش اس موقع پر بڑے سازوسامان سے آئے تھے تقریباً ۳ ہزار کی جمعیت اور جنگ کا کافی سامان ساتھ تھا۔ عربوں میں جس جنگ میں عورتیں شامل ہوتی تھیں اس میں وہ جان پر کھیل کر لڑتے تھے۔ اُنھیں یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر لڑائی میں ہار ہوگئی تو عورتوں کی بے عزتی ہوگی۔ اس لڑائی کے موقع پر بہت سی عورتیں بھی فوج کے ساتھ تھیں ان میں سے بہت سی تو وہ تھیں جن کے بیٹے اور عزیز بدر کی لڑائی میں مارے گئے تھے اور اُنھوں نے منتیں مانی تھیں کہ وہ ان کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گی۔

لڑائی کی ابتدا:۔

قریش نے اپنی فوج کو بہت اچھی تربیت دی تھی۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو سب سے پہلے قریش کی عورتوں نے دف پر جوش اور غیرت دلانے والے اشعار

پڑھنا شروع کیے تا کہ لڑنے والوں میں بدر کے مقتولین کا غم اوران کے خون کا بدلہ لینے کا جوش خوب ابھرآئے۔ اس کے بعد لڑائی شروع ہوئی۔ شروع میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور قریش کی فوج کے بہت سے لوگ مارے گئے ان کی فوج میں ابتری پھیل گئی اور مسلمان یہ سمجھے کہ اُنھوں نے میدان مارلیا۔ چنانچہ اُنھوں نے اس ابتدائی فتح کو آخری حد تک پہنچانے کے بدلے مال غنیمت لوٹنا شروع کردیا۔ ادھر جو لوگ درّے کی حفاظت پر لگائے گئے تھے اُنھوں نے جب دیکھا کہ مسلمان مال لوٹنے میں لگے ہوئے ہیں اور دشمن کے پیر اُکھڑ گئے ہیں تو وہ سمجھے کہ لڑائی کا خاتمہ ہو چکا ہے اور وہ بھی مال غنیمت لوٹنے کے لئے لپکے۔ ان کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر نے اُنھیں روکا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یاد دلایا مگر سوائے چند آدمیوں کے اور کوئی نہ رُکا۔

قریش کا عقب سے حملہ:-

خالد بن ولید نے جو اس وقت کافروں کے لشکر کے ایک رسالے کی کمان کررہے تھے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ حضرت عبداللہ بن جبیر اوران کے چند ساتھی جو درّے کی حفاظت کے لئے باقی رہ گئے تھے اُنھوں نے مقابلہ بھی کیا لیکن وہ کافروں کے اس حملے کو روک نہ سکے اور شہید ہوگئے۔ دشمن یکا یک پیچھے سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ ادھر جو بھاگتے ہوئے لوگوں نے یہ رنگ دیکھا تو وہ بھی پلٹ پڑے اور اب دونوں طرف سے مسلمانوں پر حملہ ہوگیا۔ اس صورت حال نے

مسلمانوں کو ایسا بوکھلا دیا کہ ایک دم لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمان تتر بتر ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ انتہا یہ کہ گھبراہٹ میں خود مسلمانوں کے ہاتھ سے مسلمان شہید ہو گئے اور اسی گھبراہٹ میں یہ غلط افواہ اڑ گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس خبر سے صحابہ کے رہے سہے اوسان خطا ہو گئے اور کتنے ہی لوگوں نے ہمت ہار دی۔

اللہ کی مدد اور فتح:-

اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دس بارہ صحابہ اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ زخمی بھی ہو چکے تھے۔ صحابہ آپ کو لے کر ایک پہاڑی کی طرف آ گئے اور عین وقت پر مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بصحت وعافیت موجود ہیں چنانچہ وہ پھر سمٹ کر آپ کے گرد جمع ہوئے لیکن اس موقع پر معلوم نہیں کیا صورت پیش آئی اور کس طرح کافروں کے منہ لڑائی سے مڑ گئے اور وہ اپنی جیت کو مکمل کیے بغیر میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

جب کفار کئی منزل دور چلے گئے تو اُنھیں ہوش آیا اور اُنھوں نے آپس میں کہا کہ یہ ہم نے کیا غلطی کی کہ مسلمانوں کی طاقت کو بالکل ختم کر دینے کا موقع ہاتھ آیا تھا اُسے اس طرح کھو دیا اور یوں ہی لوٹ آئے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک جگہ ٹھہر کر مشورہ کیا کہ اب مدینے پر دوبارہ حملہ کرنا چاہیے لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور مکے واپس چلے گئے۔ اُدھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خیال تھا کہ کہیں دشمن پھر نہ پلٹ پڑے چنانچہ آپ نے بھی مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کا پیچھا کرنا چاہیے۔ یہ بڑا نازک موقع تھا مگر جو لوگ سچے مومن تھے وہ اللہ کے

بھروسے پر پھر جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام حمراء الاسد تک دشمن کے پیچھے گئے۔ یہ مقام مدینے سے کوئی ۸ میل کے فاصلے پر ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ قریش مکے واپس ہو گئے تو آپ بھی مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

احد کی لڑائی میں ستر صحابہ شہید ہوئے ان میں زیادہ تر انصار تھے مدینے کا ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ ماتم کرنا اور نوحہ کر کے رونا پیٹنا مسلمان کی شان نہیں۔

ابتدائی شکست کے اسباب اور مسلمانوں کی تربیت:-

احد کی لڑائی میں مسلمانوں کو جو پہلے شکست ہوئی اس میں اگر چہ منافقوں کی تدبیروں اور چالوں کو بھی بڑا دخل تھا مگر ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا بھی حصہ کچھ کم نہ تھا۔ تحریک اسلامی جس قسم کا مزاج بنانا اور اپنے کارکنوں کی جیسی تربیت کرنا چاہتی ہے اس کے لئے ابھی پورا موقع نہیں ملا تھا اللہ کی راہ میں جان کی بازی لگانے کا یہ دوسرا ہی موقع تھا اور اس موقع پر کچھ نہ کچھ کمزوریوں کا اظہار ہوا، مثلاً مال کی محبت میں اپنی ڈیوٹی کو چھوڑ دینا، اپنے ذمہ دار کے احکام کی نافرمانی کرنا، دشمن کی طاقت کو ختم کرنے سے پہلے مال غنیمت کی طرف متوجہ ہو جانا وغیرہ۔ اس لئے اس جنگ کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے جنگ کے حالات پر ایسا تبصرہ فرمایا جس میں اسلامی نقطہ نظر سے مسلمانوں کے اندر جو کوتاہیاں باقی رہ گئی تھیں ان میں سے ایک ایک کو ظاہر کیا اور اس سے متعلق ضروری ہدایات دیں۔ یہ ہدایات سورۂ آل عمران کے آخری حصے میں ملتی

ہیں۔ان میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے تاکہ ایک بار پھر یہ اندازہ ہو سکے کہ اسلامی تحریک میں جنگ کا مقام کیا ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے جنگ کے واقعات اور حالات پر کس طرح روشنی ڈالی جاتی ہے۔

توکل:-

مسلمان جب مقابلے کے لئے چلے تو ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی جب کہ دشمن کی تعداد تین ہزار تھی اس پر بھی کچھ دور جا کر تین سو منافقین ایک دم الگ ہو گئے اور اب مسلمان ۷۰۰ ہی رہ گئے۔لڑائی کا سامان بھی کم تھا اور اب ایک تہائی فوج بھی کم ہو گئی۔اسی نازک موقع پر کچھ لوگوں کے دل ٹوٹنے لگے۔ اس وقت صرف اللہ پر ایمان اور اس کی مدد پر بھروسہ ہی تھا جو مسلمانوں کو دشمن کے مقابلے کے لیے لے گیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس موقع پر جو تسلی دی تھی اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے۔یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔حالانکہ اللہ ان کی مدد کے لئے موجود تھا اور مومنوں کو تو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے آخر اس سے پہلے بدر کی لڑائی میں اللہ تمھاری مدد کر چکا ہے۔حالانکہ تم بہت کمزور تھے۔لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے، یاد کرو جب تم (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) مومنوں سے کہہ رہے تھے۔"کیا تمھارے لئے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمھاری مدد کرے بیشک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس وقت دشمن تمھارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اس وقت تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا یہ بات اللہ

نے تمھیں اس لئے بتا دی ہے کہ تم خوش ہوجاؤ اور تمھارے دل مطمئن ہوجائیں۔ فتح ونصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا دانا وبینا ہے۔‘‘ (آل عمران آیت ۱۲۲تا۱۲۶)

مسلمانوں کو آخری طور پر سمجھا دیا گیا کہ مادّی قوت پر بھروسہ مسلمان کا کام نہیں اس کی قوت کا اصل سرچشمہ اللہ پر ایمان اور اس کی مدد پر بھروسہ ہے۔

مال کی محبت:-

احد میں شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین لڑائی کے موقع پر مال کی محبت میں گرفتار ہوگئے اور دشمن کو پوری طرح مار بھگانے سے پہلے مال کی طرف متوجہ ہوگئے یہاں تک کہ جن لوگوں کے ذمے درّے کی حفاظت تھی ان سے بھی اس بارے میں کوتاہی ہوگئی اور اس طرح لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں سے مال کی محبت نکالنے کے لیے اس موقع پر مال کی محبت پیدا کرنے والے ایک سب سے بڑے سبب کو بھی ختم فرمایا یعنی اسی موقع پر سود کو حرام ٹھہرایا سود کے کاروبار کرنے والوں کے دلوں میں مال کی محبت ایسی رچ بس جاتی ہے کہ وہ ان کو کسی اونچے کام کے لائق نہیں چھوڑتی۔ اسی سے ایک طبقہ میں لالچ، بخیلی، خودغرضی اور مال کی محبت پیدا ہوتی ہے اور دوسرے طبقے میں نفرت، غصہ اور بغض وحسد پیدا ہوتا ہے۔

کامیابی کی ضمانت:-

اگر ہمتوں کو بلند رکھنے کے لئے کوئی محرک موجود نہ ہو تو ناکامی کے بعد ہمتوں میں کمی آہی جاتی ہے۔ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی ہوسکتا تھا کہ

کچھ لوگوں کے دل ٹوٹنے لگتے تو اس موقع پر مسلمانوں کو ضمانت دی گئی کہ تم کو نہ کم ہمت ہونا چاہیے اور نہ غم کرنا چاہیے جیت تمھاری ہی ہوگی بشرطیکہ تم مومن ہو۔تم ایمان پر قائم رہو اور اس کے تقاضے پورے کرتے رہو تمھارا اتنا ہی کام ہے اس کے بعد تم کو سربلند کرنا اور فکر اور غم سے نجات دینا اللہ کا کام ہے۔رہ گئیں یہ وقتی طور پر کچھ تکلیفیں اور یہ شکست تو تمہارے مقابل گروہ کو بھی ایسی ہی مصیبتیں آیا کرتی ہیں۔جب وہ باطل پر ہوتے ہوئے ہمت نہیں ہارتے تو تم حق پر ہوتے ہوئے کیوں فکر کرتے ہو۔تم تو جنت کے خواہاں ہو۔تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم جنت میں یوں ہی چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو جانچا ہی نہیں کہ تم میں سے کون اس کی راہ میں جان لڑانے والے ہیں اور کون اس کی خاطر ناخوشگوار حالات پر صبر کرنے والے ہیں۔ (آل عمران آیت ۱۳۹ تا ۱۴۲)

اسلامی تحریک کا اصل محرک:-

یوں تو ہر تحریک میں کوئی نہ کوئی مرکزی شخصیت اس تحریک کی جان ہوتی ہے لیکن اُصولی تحریکوں کی بقاء اور ترقی کا مدار کبھی بھی کسی شخصیت پر نہیں ہوتا بلکہ ان اُصولوں کی پختگی اور صداقت پر ہوتا ہے جسے وہ تحریک لے کر اُٹھی ہے۔اسلامی تحریک کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کی شخصیتیں جتنی اہم ہوتی ہیں اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔لیکن چونکہ یہ تحریک ایک اصولی تحریک ہے اور اس کی بقا اور ترقی کا مدار خالص ان اصولوں کی قوت پر ہوتا ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اس لئے مسلمانوں کو یہ بات بتانا بھی ضروری تھا کہ کہیں ان کے ذہنوں کے کسی گوشے میں یہ بات نہ پڑی رہ جائے کہ جب تک نبی کا مبارک وجود ان کے

درمیان موجود ہے اس وقت تک وہ اللہ کے دین کا علم بلند کریں گے لیکن اگر کسی وقت وہ اس ذات مبارک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی براہ راست رہنمائی سے محروم ہو جائیں تو وہ اس راہ سے ہٹ کر کوئی اور راہ اختیار کرلیں گے چنانچہ احد کے میدان میں جب یہ غلط خبر مشہور ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے تو کچھ مسلمانوں کے دل چھوٹ گئے اور اُنھوں نے سوچا کہ جب حضور ہی کا سایہ اُٹھ گیا تو اب لڑ کر کیا کریں گے اس خیال کی اصلاح کے لئے اس موقع پر اُنھیں سمجھایا گیا کہ دیکھو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گذر چکے ہیں پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کردیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے یاد رکھو جو اُلٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکر گذار بندے بن کر رہیں گے اُنھیں وہ اجر دے گا۔'' (آل عمران آیت ۱۴۴) تم نے جس دین کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اس پر قائم رہنے اور اُسے قائم کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اللہ کے نبی ہمیشہ تمھارے ساتھ موجود رہیں بلکہ یہ تو تمھاری اپنی فلاح و بہبود کا سودا ہے۔ اس پر قائم رہو گے تو خود ہی کچھ پاؤ گے اور اس دین کی اصل قوت وہ سچائی ہے جسے یہ پیش کرتا ہے۔ اس کی سربلندی کا مدار نہ تمھاری قوتوں پر ہے اور نہ کسی خاص شخصیت پر۔

کمزوری کی جڑ:-

انسان کی تمام کمزوریوں کی جڑ موت کا ڈر ہے۔ اس موقع پر اُنھیں یاد دلایا گیا کہ موت کے ڈر سے بھاگنا بالکل فضول ہے کوئی جان دار اس وقت تک مر

نہیں سکتا۔ جب تک اس کی موت کا وقت نہ آ جائے اللہ کے اس مقرر کیے ہوئے وقت سے پہلے نہ کوئی مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد ایک لمحہ کے لئے جی سکتا ہے۔ لٰہذا تم کو موت سے بچنے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں فکر اس بات کی ہونا چاہیے کہ زندگی کی جو مہلت ملی ہوئی ہے وہ کاہے میں صرف ہو رہی ہے دنیا کمانے میں آخرت حاصل کرنے میں؟ اس لئے جو شخص دنیا کمانے کے لئے اپنی محنتیں لگا دیتا ہے تو پھر اُسے جو کچھ ملتا ہے اسی دنیا میں مل جاتا ہے جو آخرت کے ثواب کے لئے کام کرتا ہے پھر اُسے اللہ تعالیٰ آخرت کا ثواب دے گا۔ جن لوگوں کو اللہ کا دین قبول کرنے، اس پر قائم رہنے اور اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنے کی نعمت حاصل ہو چکی ہے اُنھیں اس سب سے زیادہ قیمتی نعمت کی قدر کرنا چاہیے اور اِس کی طرف اپنا سب کچھ لگا دینا چاہیے۔ اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلے گا آخرت کی دائمی کامیابی ان کے حصے میں آئے گی اور اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی بہترین نعمتوں سے نوازے گا اور وہ اپنے مالک سے بہترین جزا پائیں گے۔

احد کی شکست کے بعد

دو ایک قبیلوں کو چھوڑ کر عرب کے تقریباً تمام ہی قبائل اس نئی اُٹھتی ہوئی اسلامی تحریک کے مخالف تھے اس تحریک کی زد ان کے آبائی مذہب اور رسم ورواج پر پڑتی تھی اس کا تقاضا تھا کہ انسان اخلاقی اعتبار سے بلند ہو اور اُن باتوں کو چھوڑے جو عرب میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں مثلاً شراب، جوا، زِنا اور لوٹ مار وغیرہ۔ بدر کی جنگ سے پہلے بہت سے قبیلے یہ سوچ رہے تھے کہ کس

طرح اس نئی تحریک کو ختم کیا جائے لیکن بدر میں قریش کی شکست کے بعد ان کی ہمتیں بھی کچھ پست ہوگئی تھیں اور یہ ایک طرح کے تردّد میں پڑ گئے تھے کہ اب کیا رویہ اختیار کیا جائے لیکن احد کی لڑائی کے بعد حالت بدل گئی اور عرب کے بہت سے قبائل اسلام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے چند قبیلوں کے واقعات حسب ذیل ہیں۔

قبائل کی بدعھدی:-

۱-محرم سن ۴ھ میں، علاقہ قطن کے ایک قبیلے جو فید نے مدینے پر حملے کا ارادہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسلمہ کو ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ ان کے مقابلے کیلئے روانہ فرمایا اور حملہ کرنے والے بھاگ کھڑے ہوئے۔

۲-اس کے بعد اسی مہینے میں کوہستان عرنہ کے ایک قبیلے لحیان نے مدینے پر چڑھائی کا ارادہ کیا حضرت عبداللہ بن انیس ان کے مقابلے کے لئے بھیجے گئے اور ان کا سردار سفیان قتل ہوا اور حملہ کرنے والے واپس ہو گئے۔

۳-صفر ۴ھ میں قبیلۂ کلاب کا سردار ابو براء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ چند لوگ میرے ساتھ بھیج دیجیے۔ میری قوم کے لوگ اسلام کی دعوت سننا چاہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر صحابہ اس کے ساتھ کر دیے۔ ان میں سے بہت سے اصحاب صفہ[1] میں سے تھے۔ ان

---

[1] صفہ عربی میں چبوترے کو کہتے ہیں۔ مسجد نبوی کے صحن میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر ایسے لوگ قیام کرتے تھے جو گھر بار والے نہ تھے ان کا معمول تھا کہ کچھ لکڑیاں وغیرہ کاٹ لاتے اور اسی سے گذر کرتے، کچھ دوسرے صحابہ بھی ان کی مدد کرتے تھے ان لوگوں کا خاص کام دین کا علم سیکھنا اور عبادت کرنا تھا۔

لوگوں کو قبیلے کے رئیس عامر بن طفیل نے گھیر کر قتل کرا دیا۔ اس واقعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا صدمہ ہوا۔ مہینہ بھر تک نماز فجر میں آپ نے ان ظالموں کے لئے بددعا فرمائی۔ ان ستر صحابہ میں سے صرف ایک صحابی حضرت عمرو بن اُمیّہ کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی۔ جا میں تجھے اس منت میں آزاد کرتا ہوں۔ جب حضرت عمرو بن امیہ واپس آرہے تھے تو راستے میں اُنھیں عامر کے قبیلے کے دو آدمی ملے۔ آپ نے اُنھیں قتل کر دیا اور یہ سمجھے کہ ہم نے قبیلۂ عامر کے لوگوں کی بے وفائی کا کچھ تو بدلہ لے لیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے سخت ناپسند فرمایا کیونکہ آپ اس قبیلے کے لوگوں کو امان دے چکے تھے۔ اور یہ بات اس اقرار کے خلاف تھی چنانچہ آپ نے ان دونوں کے خوں بہا ادا کر دینے کا اعلان فرما دیا۔

اسی طرح دو اور قبیلوں نے بھی اسی قسم کی حرکت کی۔ آپ نے ان کے کہنے سے دس صحابہ کو دین کی تعلیم کیلئے ان کے ساتھ بھیج دیا لیکن ان ظالموں نے بدعہدی کی۔ ان میں سے سات صحابہ کفار سے لڑ کر شہید ہوئے اور تین گرفتار ہو گئے ان میں حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ بھی تھے۔ دشمنوں نے اُنھیں مکے میں لے جا کر بیچ ڈالا۔ حضرت خبیب نے احد کی لڑائی میں ایک شخص حارث بن عامر کو قتل کیا تھا حارث کے بیٹوں نے حضرت خبیب کو اس لئے خرید لیا کہ وہ اُنھیں اپنے باپ کے بدلے میں قتل کریں گے۔ چنانچہ چند روز کے بعد اُنھوں نے آپ کو شہید کر ڈالا اسی طرح حضرت زید کو صفوان بن امیّہ نے قتل کرنے کیلئے خریدا اور خرید کر شہید کر ڈالا۔

اس طرح ایک طرف عرب کے قبیلوں سے برابر اسی چھیڑ چھاڑ چلی جارہی تھی جس میں زیادتی مخالفین ہی کی طرف سے ہو رہی تھی اور مسلمان ان کے ظلم برداشت کررہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اسی زمانے میں یہود کے ساتھ بھی ایسے معاملات پیش آئے جو مسلمانوں کے لئے کافی پریشانی کا موجب بنے۔

یہودی علماء اور پیروں کی مخالفت:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ مدینہ تشریف لانے کے بعد یہودیوں کے قبیلوں سے مختلف قسم کے معاہدے کر لیے تھے اور ان کو اطمینان دلا دیا تھا کہ ان کے جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور ان کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی لیکن یہود کے علماء اور پیر خاص طور پر اسلامی تحریک کی ترقی سے بے چین رہتے تھے اور یہ بلاسبب نہ تھا چند اسباب حسب ذیل ہیں:

(ا) اب تک مذہبی اعتبار سے یہود کو ایک قسم کی بڑائی حاصل تھی اور سب لوگ ان کو خدا پرستی اور دین داری کے اعتبار سے قابل عزت سمجھتے تھے لیکن اب اسلامی تحریک کے پھیلنے سے ان کی غلط مذہبیت اور پیشہ ورانہ خدا پرستی کی پول کھلتی جاتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مواعظ سن کر لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ واقعی سچی مذہبیت کسے کہتے ہیں اور حقیقی خدا پرستی کا مفہوم کیا ہے؟ اس طرح ان عالموں اور پیروں کا ''کاروبار'' مدھم پڑھتا جاتا تھا۔

۲-قرآن کریم میں یہود کے عوام اور خاص طور پر ان کے اہل علم اور دین دار قسم کے لوگوں کے اخلاق اور معاملات پر کھلی کھلی تنقیدیں نازل ہو رہی تھیں مثلاً ''وہ جھوٹ باتوں کے سننے والے اور حرام مال کے بڑے کھانے والے ہیں''

(سورۂ مائدہ آیت ۴۲) ''تو ان میں سے اکثروں کو دیکھے گا کہ گناہ اور زیادتی کی طرف تیزی سے بڑھنے والے ہیں (مائدہ آیت ۶۲) ''یہ سود کھانے والے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا'' اور یہ لوگوں کا مال کھا اڑا لیتے ہیں'' (نساء آیت ۱۶۱) اسی طرح کی بہت سی تنقیدیں سورۂ بقرہ، مائدہ اور آل عمران وغیرہ میں موجود ہیں۔ ان سب کو سن کر سوائے چند نیک نفس لوگوں کے ان کے اکثر لوگ چراغ پا ہو جاتے تھے اور اندھا دھند اسلامی تحریک کی مخالفت پر اتر آتے تھے۔

۳- اسلام کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر اُنھیں یہ خطرہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ایک نہ ایک دن اُنھیں اس کے آگے سر جھکانا ہی پڑے گا۔

چنانچہ ان ہی اسباب کی بنا پر یہود اسلامی تحریک کے سخت دشمن ہو گئے تھے۔

غزوۂ بنی قینقاع:-

سب سے پہلے بدر کی فتح کے بعد یہود نے کان کھڑے کیے اور اُنھیں یہ اندیشہ صاف دکھائی دینے لگا کہ اب اسلام ایک طاقت بنتا جاتا ہے چنانچہ بدر کی لڑائی کے فوراً بعد ہی شوال ۲ھ میں یہود کے قبیلے بنی قینقاع نے مسلمانوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدہ کیا تھا اس کو توڑ ڈالا۔ اس جنگ کا فوری سبب یہ ہوا کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان خاتون کی بے حرمتی کی۔ ان کے شوہر نے بیتاب ہو کر ایک یہودی کو مار ڈالا۔ اس پر یہودیوں نے اُس مسلمان کو قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملے کو رفع دفع فرمانے کی کوشش کی۔ لیکن یہود نے کہا کہ ہم قریش نہیں ہیں

کہ جو بدر میں منہ پھیر کر چلے گئے۔ ہم سے واسطہ پڑا تو دکھادیں گے کہ لڑائی اسے کہتے ہیں۔ اس طرح جب یہود کی طرف سے معاہدے کی پروا کیے بغیر لڑائی کا اعلان ہوا تو آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی کی تیاری کی۔ یہود نے اپنے آپ کو اپنے قلعہ میں محفوظ کرلیا۔ پندرہ دن کے محاصرے کے بعد یہ طے پایا کہ یہود کو جلاوطن کر دیا جائے۔ چنانچہ سات سو یہود جلاوطن کر دیے گئے۔

کعب بن اشرف کا قتل:-

یہود میں کعب بن اشرف مشہور شاعر تھا۔ اس نے بدر کی لڑائی کے بعد ایسے اشعار لکھے کہ جن سے مسلمانوں کے خلاف مکے میں آگ لگ گئی۔ اس زمانے میں شاعروں کا بڑا اثر تھا۔ اس نے بدر کی لڑائی میں قتل ہونے والے قریش کے ایسے پر درد مرثیے لکھے اور پھر انھیں جا کر مکے میں سنایا کہ جو سنتا تھا سر پیٹتا تھا اور روتا تھا پھر مدینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہے اور لوگوں کو طرح طرح سے آپ کے خلاف اُبھارا۔ ایک بار تو ایک دعوت کے بہانے بلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کی بھی سازش کی۔ ان حالات کے پیش نظر آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کیا ہونا چاہیے۔ چنانچہ آپ کی مرضی سے حضرت محمد بن مسلمہ نے کعب بن اشرف کو ربیع الاول ۳ھ میں قتل کر دیا۔

بنونضیر کا اخراج:-

بنونضیر کے یہودیوں نے کئی معاملات میں بدعہدی کی اور کئی مرتبہ ایسی خفیہ سازشیں کی جن کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا تھا۔ اس مقصد کیلئے ان کو مکے کے قریش نے بھی اُبھارا تھا جب ان کی حرکتیں حد سے بڑھ گئیں تو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ ۱۵ر دن تک جاری رہا۔
آخر کار مجبور ہو کر بنو نضیر اس شرط پر راضی ہو گئے کہ وہ اپنا جتنا مال و اسباب اونٹوں پر
لاد کر لے جا سکیں لے جائیں اور اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکل جائیں اس معاہدے کی
رو سے ان کے کتنے ہی سردار خیبر چلے گئے یہ لوگ اپنے ساتھ بہت سا ساز وسامان
لے گئے صرف وہی سامان پیچھے چھوڑا جسے یہ لے جا نہیں سکتے تھے۔

اب مسلمانوں کے دونوں دشمن یعنی مشرکین عرب خصوصاً مکے کے قریش اور
یہودی مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کر ڈالنے کی ترکیبیں سوچنے لگے اور تمام قبائل نے
مل کر مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کردیں ابتداء میں تو جب بھی آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا کہ قبائل مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے
ہیں تو آپ مسلمانوں کی جمعیت لے کر ان کے مقابلے کیلئے نکلے لیکن دشمن نے
مقابلہ نہ کیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک بار محرم ۵ھ میں آپ ذات الرقاع تک
تشریف لے گئے اور دوسری بار ربیع الاول ۵ھ میں دومتہ الجندل تک۔

غزوۂ احزاب [1]

بنو نضیر مدینے سے نکل کر خیبر پہنچے اُنھوں نے اسلام کے خلاف ایک بڑی
سازش شروع کی آس پاس کے قبیلوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ مکے میں

---

[1] اس غزوہ کا نام غزوہ خندق بھی ہے کیونکہ اس میں خندق کھود کر اپنا بچاؤ کیا گیا تھا۔ احزاب
عربی میں فوجوں کو کہتے ہیں چونکہ اس میں کفار کی فوجیں ایک ساتھ امنڈ آئی تھیں اس لئے اس غزوہ
کو غزوہ احزاب بھی کہتے ہیں۔

جا کر قریش کو لڑائی کے لئے تیار کیا اور کہا کہ اگر سب مل کر حملہ کریں تو اس نئی تحریک کو کچل ڈالا جائے۔ قریش تو اس بات کے لئے تیار ہی تھے۔ چنانچہ یہودیوں کے بہت سے قبیلوں نے اور مکے کے قریش نے مل کر ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا جس کی تعداد کا اندازہ دس ہزار کیا جاتا ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ اتنے بڑے پیمانے پر مدینہ پر چڑھائی کی تیاریاں ہو رہی ہیں تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ کھلے میدان میں اتنی بڑی تعداد سے مقابلہ مناسب نہیں ہے۔ ہمارا لشکر کسی محفوظ مقام میں رہے اور اس کے گرد خندق کھود لی جائے تا کہ دشمن براہ راست حملہ نہ کر سکے۔ یہ رائے پسند کی گئی اور خندق کھودنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

خندق کی تیاری:-

مدینہ تین طرف سے مکانات اور نخلستان سے گھرا ہوا تھا، صرف ایک رخ کھلا ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر اسی رخ پر خندق کھودنے کا حکم دیا۔ یہ کام ۸ ذوقعدہ ۵ھ کو شروع ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خندق کی داغ بیل ڈالی اور دس دس گز زمین دس دس آدمیوں پر تقسیم کر دی۔ خندق ۵ گز گہری کھودنا تھا۔ بیس دن کے اندر ۳ ہزار مسلمانوں نے یہ خندق تیار کر لی۔ خندق کھودنے کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تمام لوگوں کے ساتھ کام میں مصروف رہے۔ ایک مقام پر اتفاق سے ایک چٹان آ گئی وہ کسی طرح ٹوٹنے میں نہ آتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف

لائے اور ایک کدال ایسا مارا کہ ساری چٹان چورا چورا ہوگئی۔ یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔

کفار کا حملہ:-

کفار کے لشکر نے تین حصوں میں تقسیم ہو کر مدینے پر تین طرف سے حملہ کیا۔ یہ حملہ انتہائی شدید تھا اس کا نقشہ قرآن پاک میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

''جب دشمن اوپر کی طرف (مشرق سے) اور نشیب کی طرف (مغرب سے) تم پر ٹوٹ پڑے اور جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے اس وقت مسلمانوں کی جانچ کا وقت آ گیا اور وہ بری طرح جھنجوڑ ڈالے گئے۔

(سورہ احزاب آیت ۱۰۔۱۱)

یہ وقت بڑے ہی سخت امتحان کا تھا۔ ایک طرف سردی کا انتہائی سخت موسم، کھانے پینے کے سامان کی کمی، مسلسل کئی کئی وقت کے فاقے، نہ راتوں کی نیند، نہ دن کا آرام، ہر وقت جان کا خطرہ، مال اور اولاد سب کچھ دشمن کی زد پر، مقابلے میں بے پناہ لشکر کا ہجوم، یہ سب واقعات ایسے تھے کہ اس حالت میں وہی لوگ ثابت قدم رہ سکتے تھے جن کے ایمان سچے اور مضبوط تھے، کمزور ایمان والے اور منافقین ان حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے چنانچہ مسلمانوں کی فوج میں جو منافق گھسے ہوئے تھے وہ اس موقع پر صاف کھل کر سامنے آ گئے ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ''ہم سے اللہ نے اور اس کے رسول نے (فتح

ونصرت کے) جو وعدے کیے تھے وہ سب دھوکا ہی تھا'' (احزاب آیت ۱۲) ان لوگوں نے اپنی جان بچانے کے لئے بہانے ڈھونڈنا شروع کر دیے اور کہنے لگے کہ ''اے یثرب والوں واپس چلے جاؤ۔ آج تمھارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے'' ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر کہنا شروع کیا کہ ہمیں تو اجازت دے دی جائے تا کہ ہم اپنے گھروں پر ہی رہ کر حفاظت کریں۔ ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں (احزاب آیت ۱۴) لیکن جن لوگوں کے دلوں میں ایمان موجود تھا اور جو اپنے ایمان کے دعوے میں سچے تھے ان کی حالت اس موقع پر بالکل دوسری تھی۔ اُنھوں نے جب کافروں کے اس لشکر کو دیکھا تو وہ بول اٹھے یہی تو (حالات) ہیں جن کا وعدہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے کیا تھا۔'' اور ان حالات کو دیکھ کر ان کے اندر ایمان کا جذبہ تازہ ہو گیا اور وہ زیادہ اطاعت اور فرماں برداری کے لئے تیار ہو گئے۔ ان سخت حالات نے ان کے اندر ذرّہ برابر بھی تبدیلی پیدا نہ ہونے دی۔''

(احزاب ۲۲،۲۳)

دشمن تقریباً ایک مہینے تک گھیرا ڈالے پڑے رہے۔ یہ محاصرہ اتنا سخت تھا کہ مسلمانوں کو تین تین وقت تک کھانا میسر نہ آتا تھا۔ محاصرہ انتہائی شدید اور خطرناک ہو چکا تھا۔ محاصرہ کرنے والے خندق کو پار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ دوسری طرف ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج کو خندق کے مختلف حصوں پر لگا دیا تھا۔ کفار باہر سے پتھر اور تیر برساتے تھے۔ اور ادھر سے بھی جواب دیا جاتا تھا۔ اس درمیان میں اِکّا دکّا حملے بھی ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی کفار کا

دباؤ اتنا بڑھ جاتا تھا کہ ان کو خندق کے اس پار روکنے کے لئے پوری مستعدی سے جم کر مقابلہ کرنا پڑتا تھا یہاں تک کہ دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ نماز تک قضا ہوگئی۔

اللہ کی مدد:-

محاصرہ جتنا لمبا ہوتا جاتا تھا حملہ کرنے والوں کی ہمتیں کم ہوتی جاتیں تھیں۔ دس ہزار آدمیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر انتہائی سردی۔ اسی دوران ایک بار ایسی سخت طوفانی ہوا چلی کہ کافروں کے خیمے اکھڑ گئے۔ ساری فوج تتر بتر ہوگئی ہوا کیا تھی خدا کا عذاب تھا اور واقعی یہ طوفان اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے رحمت اور کافروں کے لئے عذاب بنا کر ہی بھیجا تھا۔ اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان فرمایا ہے۔

> ''مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ فوجیں تم پر ٹوٹ پڑیں تو ہم نے ان پر طوفانی آندھی بھیجی اور ایسی فوج بھیجی (فرشتوں کی فوج) جس کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔''

(احزاب ۹)

چنانچہ کافران حالات کا مقابلہ نہ کر سکے ان کی قوت ٹوٹ گئی۔ یہود نے پہلے کنّی کاٹی اور جب قریش تنہا رہ گئے تو ان کو بھی سوائے واپس جانے کے اور کوئی صورت نظر نہیں آئی اور اس طرح محض اللہ کے فضل اور اس کی غیبی امداد سے مدینے پر جو بادل چھا گئے تھے وہ آپ سے آپ چھٹ گئے۔ اس غزوہ کا ذکر قرآن پاک میں جس انداز میں آیا ہے اور اس میں مسلمانوں کی تربیت اور تذکیر کے جو پہلو نمایاں کیے گئے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

اللہ کے فضل پر بھروسہ:-

مومن کا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کے پاس ہے جو کچھ ہوتا ہے اس کی مشیت اور اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی کسی کامیابی کو اپنی تدبیروں یا اپنی قوت کا نتیجہ نہیں سمجھتا بلکہ اُسے اللہ کا فضل سمجھتا ہے جیسا کہ واقعتاً وہ ہے۔ احزاب کی لڑائی میں دس بارہ ہزار کا لشکر تین ہزار مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور اسے پریشان ہو کر واپس جانا پڑا۔ یہ موقع ایسا تھا کہ ہوسکتا تھا کچھ مسلمان اس طرح سوچنے لگتے کہ یہ ان کی اپنی تدبیر کا نتیجہ تھا۔ (یعنی خندق کھودنا) اس لئے اس تدبیر پر ناز کرنے کا اچھا خاصہ موقع تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے بروقت اس کمزوری سے بچانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ "اے ایمان والو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب فوجیں تم پر ٹوٹ پڑیں تو ہم نے ان پر طوفانی آندھی بھیجی اور ایسی فوج جسے تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔"

(احزاب آیت ۹)

اسلامی تحریک کے علم برداروں کے لئے ذہن کی یہی تربیت مطلوب ہے کہ ان کا بھروسہ صرف اللہ کے فضل پر ہو اور صرف خدا کو کارساز مطلق سمجھتے ہوئے وہ اقامت دین کی جدوجہد میں مسلسل قدم بڑھاتے رہیں۔ چاہے مقابل کی قوت اور طاقت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

دعویٰ ایمان کی جانچ:-

مصائب کے وقت انسان کے ایمان کی جانچ ہو جاتی ہے اسے خود بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور دوسرے بھی اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس راہ

میں کون کس حد تک جم سکتا ہے جب تک حالات معمولی ہوتے ہیں بہت سے لوگوں کے بارے میں اندازہ ہی نہیں ہوسکتا کہ واقعی نصب العین کی محبت اور زندگی کی بازی لگا دینے کا فیصلہ کس درجے میں ہے۔ بسا اوقات خود وہ شخص اپنے متعلق بڑے دھوکے میں مبتلا رہتا ہے لیکن جب کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھرا اور کھوٹا صاف نظر آجاتا ہے۔ احزاب کی لڑائی نے یہی کام کیا۔ مدینے میں مسلمانوں کے ساتھ اچھی خاصی تعداد میں منافق اور کھوٹے ایمان کے لوگ شامل تھے اور ضرورت تھی کہ عام مسلمانوں کو ان کی صحیح پوزیشن معلوم ہو جائے۔ چنانچہ اس سختی کے وقت ان کا پردہ فاش ہو گیا مسلسل خندق کھودنے کا کام کھانے پینے اور آرام سے بے پروا ہو کر رات دن ایک کر دینا، اتنی بڑی جمعیت کے مقابلے کے لئے ہتھیلی پر جان رکھ کر تیار ہو جانا اور پھر بیس بائیس دن تک مسلسل خوف اور اندیشے کی حالت میں دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جن کے دلوں میں سچا ایمان نہ تھا وہ ان سختیوں کی تاب نہ لا سکے اور ان میں سے بہت سے تو بول اٹھے کہ اچھا رسول نے ہم سے فتح ونصرت کا وعدہ کیا تھا مگر اب تو پانسہ پلٹتا دکھائی دے رہا ہے۔ ہم جان گئے کہ ''اللہ نے اور اللہ کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ بس ایک دھوکا تھا وہ بس ایک دھوکا تھا۔'' (سورۂ احزاب ۱۲) اور کچھ نے بہانے بازی شروع کی اور اپنے گھروں کی حفاظت کا بہانہ کر کے میدان سے کھسک گئے لیکن اس کے بالمقابل جن اللہ کے بندوں کے دلوں میں صحیح ایمان موجود تھا، اُنھوں نے ان حالات سے دوسرا ہی اثر لیا۔ اُنھوں نے جب فوجوں کو امنڈ کر آتے دیکھا تو کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے یہی حالات ہیں جن کی خبر اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں پہلے ہی دے دی تھی۔ یہی تو ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا۔ ان حالات سے ان کے اندر ایمان کی قوت اور زیادہ ہوگئی اور وہ زیادہ اطاعت اور فرماں برداری کے لئے آمادہ ہو گئے۔''

(سورہ: احزاب آیت ۲۲)

کمزوری کی جڑ:-

جان اور مال کے نقصان کا خوف انسان کی سب سے بڑی کمزوری بلکہ تمام کمزوریوں کی جڑ ہے۔ اسلام اللہ کی ذات اور اس کی صفات پر جس طرح ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اس میں بنیادی طور پر یہ عقیدہ شامل ہے کہ موت اور زندگی صرف اللہ کے قبضے میں ہے نفع اور نقصان سب کچھ اللہ کے ہاتھ ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں جو موت کو ٹال سکے یا کسی طرح نفع کو نقصان میں یا نقصان کو نفع میں بدل سکے۔ یہی عقیدہ اور یہی ایمان مسلمان کی طاقت کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد جتنی کمزور ہوگی اتنی ہی کمزوری مسلمان کے ہر کام میں صاف دکھائی دے گی۔ چنانچہ اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے صاف فرما دیا گیا کہ ''اے نبی! ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم موت یا قتل کے ڈر سے بھاگو گے تو بھاگنا تمھیں کوئی فائدہ نہ دے گا اور یہ بھی بتا دیجیے کہ (وہ یہ تو سوچیں) کہ اگر اللہ یہ فیصلہ کرے کہ اُنھیں کوئی نقصان پہنچ جائے تو وہ کون ہے جو اُنھیں اللہ سے بچا لے گا۔ (اور اگر اللہ کا فیصلہ یہ ہو کہ) اُنھیں کوئی نفع پہنچائے تو وہ کون ہے جو اُسے روک دے؟ (اُنھیں یاد رکھنا چاہیے کہ) اللہ کے سوا وہ کسی کو نہ اپنا حمایتی

پا ئیں گے اور نہ مدد گار'' (سورہ:احزاب آیت ۱۰)

اگر یہ عقیدہ کسی دل میں موجود ہے تو پھر پیچھے قدم پڑنے کا کیا مطلب؟ انسان کو ہر نازک موقع پر اپنے ایمان کی جانچ کرتے رہنا چاہیے۔ بسا اوقات انسان خود اپنے بارے میں دھوکے میں مبتلا رہتا ہے اور صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی امتحان کا وقت آتا ہے۔

رسول کا قابل تقلید نمونہ:-

اسی جنگ کے تذکرے کے درمیان مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ تمھارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک قابل تقلید نمونہ ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے وہی لوگ موزوں ہو سکتے ہیں جنھیں اللہ کی ملاقات اور آخرت میں ملنے والے انعامات کی امید ہو اور جو اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد کرتے رہتے ہوں۔ اس موقع پر اہل اسلام کی ہمتوں کو بلند رکھنے، انتہائی شدید حالات میں ان کے دلوں کو مضبوط بنانے اور پورے استقلال کے ساتھ اللہ کے فضل پر بھروسہ رکھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استقلال، عزم، توکل علی اللہ اور صبر کا جو نمونہ سامنے آیا وہ قیامت تک ان تمام بندگان خدا کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے جو اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے آمادہ ہوں اور اس راہ پر قدم بڑھائیں۔ یہ نمونہ ایسا ہے جسے اُنھیں زندگی کے ہر موڑ پر سامنے رکھنا چاہیے یہی ان کے لئے اصل مشعل راہ ہے۔

بنو قریظہ کا خاتمہ:-

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں تشریف لاتے

ہی یہود کے قبیلوں سے معاہدے کیے تھے کچھ دن تک تو یہود اپنے معاہدوں پر قائم رہے لیکن پھر اُنھوں نے ان کو توڑنا شروع کر دیا چنانچہ اسی بنیاد پر بنونضیر کو ان کے وطن سے نکال دیا گیا لیکن بنوقریظہ نے پھر سے معاہدہ کرلیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں امن کے ساتھ ان کے قلعوں میں رہنے کی اجازت دے دی۔

جنگ احزاب کے موقع پر یہودی قبائل نے بنوقریظہ کو مسلمانوں کے خلاف اُکسایا اور وہ بھی جنگ احزاب میں شریک ہو گئے اور ان معاہدوں کا کوئی پاس اور لحاظ نہ کیا جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر چکے تھے۔ جب احزاب کے بادل چھٹ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے بنوقریظہ کی طرف توجہ فرمائی۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ ان کو اس بدعہدی کی سزا ضرور دی جائے۔ یہ بدعہدی اُنھوں نے ایسے نازک موقع پر کی تھی جب کہ مسلمانوں پر تمام عرب امنڈ آیا تھا اور ظاہر حالات میں مسلمانوں کے بچنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔ بنوقریظہ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے حق میں اس کھلے ہوئے دشمن سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں جو کھل کر مخالفت کرتا ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں سے معاہدہ کر کے اُنھیں اپنے سے مطمئن بھی کر دیا اور پھر وقت آنے پر صاف آنکھیں دکھا گئے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش میں دوسروں کے ساتھ مل گئے۔ چنانچہ ان کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا گیا۔ محاصرہ کوئی ایک مہینے تک جاری رہا اور آخرکار مجبور ہو کر بنوقریظہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس موقع پر خود توریت کے احکام کے مطابق ان کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کے قابل جنگ لوگ قتل کیے جائیں باقی گرفتار کر لیے جائیں

اوران کا مال واسباب ضبط کرلیا جائے۔اس موقع پر تقریباً ۴۰۰ افراد قتل کیے گئے جن میں ایک عورت بھی تھی جو اس جرم میں قتل کی گئی کہ اس نے قلعے کی دیوار پر سے پتھر گرا کر ایک مسلمان کو مارڈالا تھا۔

صلح حدیبیہ

کعبہ اسلام کا اصل مرکز تھا اُسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ نے اللہ کے حکم سے تعمیر کیا تھا۔مسلمانوں کو اسلام کے اس مرکز سے نکلے ہوئے اب چھ سال ہو چکے تھے۔ پھر اسلام کے اہم ارکان میں حج بھی ایک اہم رکن تھا اس لئے اب مسلمانوں کی شدید خواہش تھی کہ وہ خانہ کعبہ کا حج کریں۔

خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے سفر:-

یوں تو عرب والے سال بھر لڑتے رہتے تھے تاہم حج کے موقع پر چار مہینوں میں وہ اس لئے لڑائی بند کر دیتے تھے کہ لوگوں کو کعبہ تک جانے اور واپس آنے کے لئے امن میسر آجائے اور اس طرح وہ اطمینان کے ساتھ کعبے کی زیارت کرسکیں۔ ذوقعدہ ۶ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبے کی زیارت کا ارادہ فرمایا۔ بہت سے مہاجرین اور انصار اس سعادت کے منتظر تھے کہ کعبے کی زیارت ہو چنانچہ ۱۴۰۰ مسلمان ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا کی گئیں۔اس طرح اس بات کا اعلان ہو گیا کہ مسلمانوں کا ارادہ صرف خانہ کعبہ کی زیارت کا ہے لڑائی یا حملہ کا کوئی امکان

نہیں۔ پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو مکے بھیجا کہ وہ جا کر قریش کے ارادوں کی خبر لائیں وہ خبر لائے کہ قریش نے تمام قبائل کو اکٹھا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکے میں نہیں آسکتے اور یہ کہ وہ سب مقابلے کے لئے تیار ہیں۔ ان لوگوں نے مکے سے باہر ایک مقام پر اپنی فوجیں جمع کرنا شروع کر دیں اور مقابلے کے لئے بالکل تیار ہو گئے۔

قریش سے بات چیت:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اطلاع کے باوجود آگے بڑھتے رہے اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر قیام کیا۔ مکے سے ایک منزل کے فاصلے پر حدیبیہ نام کا ایک کنواں ہے اور یہی نام اس گاؤں کا بھی پڑ گیا ہے یہاں قبیلہ خزاعہ کے سردار آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ قریش نے لڑائی کی تیاری کر لی ہے اور وہ آپ کو مکے میں نہ جانے دیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ ان سے جا کر کہہ دو کہ ہم تو صرف عمرہ کے خیال سے آئے ہیں۔ لڑائی کرنا مقصود نہیں ہے۔ ہمیں خانہ کعبہ کے طواف اور زیارت کا موقع دینا چاہیے۔ جب یہ پیام قریش کے پاس پہنچا تو کچھ شریر لوگوں نے تو کہا کہ "ہمیں محمدؐ کا پیام سننے کی ضرورت نہیں ہے۔" لیکن سنجیدہ لوگوں میں سے ایک شخص عروہ نے کہا کہ "نہیں، تم میرے اوپر بھروسہ کرو اور میں جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرتا ہوں۔" چنانچہ عروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن معاملہ طے نہ ہو سکا اس درمیان قریش نے ایک دستہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کیلئے بھی بھیج دیا یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مہربانی سے ان کو معاف کر دیا اور یہ چھوڑ دیے گئے۔ اب یہ طے پایا کہ صلح کی

بات چیت کرنے کیلئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکے بھیجا جائے۔ حضرت عثمان مکے تشریف لے گئے لیکن قریش کسی طرح راضی نہ ہوئے کہ مسلمانوں کو کعبے کی زیارت کا موقع دیا جائے بلکہ اُنھوں نے حضرت عثمانؓ کو بھی روک لیا۔

بیعت الرضوان:-

یہاں مسلمانوں میں کسی طرح یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔ اس خبر نے مسلمانوں کو بے چین کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خبر کو سن کر فرمایا کہ اب تو عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینا ضروری ہے یہ کہہ کر آپ ایک ببول کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے اور یہاں آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے اس بات پر بیعت لی کہ ہم مر جائیں گے لیکن لڑائی سے منہ نہ موڑیں گے اور قریش سے حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لیں گے۔ اس قول وقرار نے مسلمانوں کے اندر عجیب جوش پیدا کر دیا اور ان میں سے ہر ایک شوق شہادت میں سرشار کفار سے بدلہ لینے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔ اس کا ذکر قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے اور جن خوش نصیبوں نے اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی اُن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔

صلح کا معاہدہ:-

مسلمانوں کے اس جوش وخروش کی اطلاع قریش کو بھی ہوئی ادھر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کی اطلاع غلط تھی۔ قریش نے سہیل بن عمرو کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تا کہ وہ صلح کے بارے میں بات چیت کریں۔ ان سے دیر تک

صلح کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی اور آخر کار صلح کی شرطیں طے ہوگئی۔ صلح نامہ لکھنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ بلائے گئے صلح نامہ میں جب یہ لکھا گیا کہ یہ معاہدہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے ہے تو قریش کے نمائندے سہیل نے اعتراض کیا کہ لفظ ''رسول اللہ'' نہیں لکھنا چاہیے اسی پر تو ہمیں اختلاف ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات مان لی۔ اور اپنے دست مبارک سے ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا دیے اور فرمایا کہ ''تم نہیں مانتے تو کیا ہوا لیکن میں خدا کی قسم اللہ کا رسول ہی ہوں۔'' جن شرطوں پر صلح ہوئی وہ یہ تھیں۔

☆ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔
☆ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن ٹھہر کر واپس چلے جائیں۔
☆ ہتھیار لگا کر نہ آئیں صرف تلوار ساتھ رکھ سکتے ہیں مگر وہ بھی نیام میں رہے گی باہر نہ نکالی جائے گی۔
☆ مکے میں جو مسلمان باقی رہ گئے ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور اگر کوئی مسلمان مکے میں واپس آنا چاہے تو اُسے بھی نہ روکیں۔
☆ کافروں یا مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکے میں جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔
☆ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ وہ مسلمانوں یا کافروں میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کرلیں۔
☆ یہ معاہدہ دس سال تک قائم رہے گا۔

یہ تمام شرطیں بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں اور ان سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مسلمانوں نے دب کر صلح کی ہے۔

حضرت ابوجندلؓ کا معاملہ :-

اتفاق کی بات کہ ابھی صلح نامہ لکھا ہی جارہا تھا کہ سہیل کے بیٹے حضرت جندلؓ مکے سے کسی طرح بھاگ کر یہاں پہنچ گئے اور بیڑیاں پہنے ہوئے مسلمانوں کے سامنے آکر گر پڑے سب کو اپنی بپتا سنائی اور بتایا کہ صرف اسلام قبول کرنے کی سزا میں ان کو کیسی کیسی تکلیفیں دی جارہی تھیں۔ ابوجندلؓ نے آنحضرت سے درخواست کی "حضور! مجھے کافروں کے پنجے سے چھڑا کر اپنے ہمراہ لے چلیں۔" سہیل نے یہ دیکھ کر کہا کہ صلح کے معاہدے کی تکمیل کا یہ پہلا موقع ہے۔ صلح نامہ کی رو سے آپ ابوجندلؓ کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ یہ بڑا نازک موقع تھا ایک طرف معاہدے کا پاس، دوسری طرف ایک مظلوم مسلمان جس پر ظلم وستم اس لئے توڑا جارہا تھا کہ وہ اسلام قبول کر چکا تھا اور جو فریاد کر رہا تھا کہ اے مسلمان بھائیو! کیا تم مجھے پھر کافروں کے ہاتھ میں دے دینا چاہتے ہو تمام مسلمان یہ صورت حال دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہاں تک کہہ دیا کہ جب آپ اللہ کے سچے نبی ہیں تو پھر ہم یہ ذلت کیوں گوارا کریں لیکن آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کرسکتا۔ خدا میری مدد کرے گا۔" غرض یہ کہ صلح نامہ مکمل ہوا۔ ابوجندلؓ کو صلح نامہ کی شرط کے مطابق واپس ہونا پڑا اور اسلام کے فدا کاروں نے اطاعت رسول کا ایک سخت امتحان پاس کرلیا۔ ایک

طرف بظاہر اسلام کی توہین تھی۔ حضرت ابو جندلؓ کی حالت زار تھی اور دوسری طرف رسول کی بے چون چرا اطاعت تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو جندلؓ سے فرمایا: ابو جندلؓ! صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمھارے لیے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا۔ اب صلح ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔'' حضرت ابو جندلؓ کو اسی طرح بیڑیاں پہنے ہوئے واپس جانا پڑا۔

صلح حدیبیہ کے اثرات:-

صلح نامہ مکمل ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں۔ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قربانی کی اور بال منڈوائے اس کے بعد صحابہ نے حکم کی تعمیل کی۔ صلح کے بعد آپ تین دن تک حدیبیہ میں ٹھہرے رہے۔ واپسی میں سورہ فتح نازل ہوئی۔ جس میں اس صلح کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے ''فتح مبین''یعنی کھلی ہوئی فتح کہا گیا ہے بظاہر یہ عجیب سی بات ہے کہ جس معاہدے کی رو سے مسلمانوں نے دب کر صلح کی اُسے کھلی ہوئی فتح کہا جائے۔ لیکن بعد کے حالات نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ واقعی حدیبیہ کی صلح اسلامی تحریک کی تاریخ میں ایک بڑی فتح کا پیش خیمہ تھی اس کی تفصیل یہ ہے۔

اب تک مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ کی کیفیت برپا تھی اور دونوں فریق کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس صلح کے معاہدے نے اس کیفیت کو ختم کر دیا اور اب مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے

سے ملنے جلنے لگے۔ اور آپس میں خاندانی اور تجارتی تعلقات ہونے لگے۔ غیر مسلم بے دھڑک مدینہ آتے اور مہینوں وہاں رہ کر مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے اس طرح اُنھیں اس نئی اسلامی جماعت کے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ یہاں آکر وہ عجیب طرح متاثر ہوتے تھے جن لوگوں کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت اور غصہ بھرا ہوا تھا اُنھیں وہ اخلاق، معاملات اور عادات میں اپنے لوگوں سے کہیں زیادہ بلند پاتے تھے پھر وہ دیکھتے تھے کہ جن اللہ کے بندوں سے ہم نے لڑائی مول لے رکھی ہے ان کے دلوں میں ان کے خلاف کوئی نفرت اور دشمنی نہیں ہے بلکہ اُنھیں جو کچھ نفرت ہے وہ ان کے غلط عقائد اور ان کے غلط طریقوں سے ہے۔ مسلمان جو بات کہتے ہمدردی اور انسانیت سے بھری ہوئی ہوتی۔ باوجود اتنی لڑائی کے مسلمان ان کے ساتھ انسانی ہمدردی اور حسن سلوک میں کوئی کمی نہ کرتے۔ پھر اس طرح ملنے جلنے کی وجہ سے غیر مسلموں کو اسلام کے بارے میں جو کچھ شکوک اور اعتراضات تھے ان کے متعلق بھی آپس میں بات چیت کرنے کا خوب موقع ملتا تھا اور غیر مسلموں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ اسلام کے بارے میں کس درجہ غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیے گئے تھے غرض یہ کہ اس صورت حال نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیے کہ غیر مسلموں کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچنے لگے اور آپس کی غلطیوں کے جو پردے ان کے لیڈروں نے ان کے دلوں پر ڈال رکھے تھے وہ سب اٹھنا شروع ہو گئے چنانچہ اس معاہدے کے بعد صرف ڈیڑھ دو برس میں اتنے لوگوں نے اسلام قبول کیا کہ اس سے پہلے کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ اسی دوران قریش کے

بعض بڑے نامور سردار تک اسلام سے متاثر ہوئے اور غیر مسلموں سے کٹ کر مسلمانوں کے ساتھی بن گئے۔ حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص اسی زمانے میں اسلام لائے۔ اور اب اسلام کا دائرہ اثر اتنا پھیل گیا اور اس کی طاقت اتنی زبردست ہوگئی کہ اب پرانی جاہلیت کو اپنی موت صاف نظر آنے لگی۔ کفار کے لیڈر اس صورت حال کا اندازہ کر کے بوکھلا اُٹھے۔ قریش کو صاف نظر آنے لگا کہ وہ اسلام کے مقابلے میں یقیناً بازی مار جائیں گے۔ اب انھیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ معاہدے کو جلد سے جلد توڑ ڈالیں اور اسلامی تحریک کے خلاف ایک بار پھر ڈٹ کر قسمت آزمائیں اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو جس طرح ہو روکیں۔ اس معاہدہ کو توڑنے کا ذکر آئندہ فتح مکہ کے سلسلے میں اپنے مناسب موقع پر آئے گا۔

++

دسواں باب

سلاطین کے نام خطوط

حدیبیہ کی صلح سے کچھ اطمینان ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت وتبلیغ کے کام پراورزیادہ توجہ فرمائی۔ایک دن آپ نے اپنے صحابہ کوخطاب فرمایا کہ ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، (میرا پیام ساری دنیا کیلئے ہے، اور یہ سب کیلئے رحمت ہے) دیکھو عیسیٰ کے حواریوں کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغام حق سب کو پہنچا دو۔''

اسی زمانے میں یعنی ٦ھ کے آخر یا شروع ٧ھ میں آپ نے بڑے بڑے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط بھی تحریر فرمائے۔جن کو لے کر مختلف صحابہ مختلف ممالک کو بھیجے گئے۔جن دعوتی خطوط کی تفصیل تاریخ میں ملتی ہے،اُن میں سے کچھ یہ ہیں:

قیصر روم کے نام خط حضرت دحیہ کلبیؓ لے کر گئے۔
خسرو پرویز شاہ ایران کے نام خط حضرت عبداللہ بن خزافہ سہمیؓ لے کر گئے۔
عزیز مصر کے نام حضرت حاطب بن ابی بلتعہ
نجاشی بادشاہ حبش کے نام حضرت عمر بن اُمیہ

قیصر روم کے نام:-

قیصر روم کے نام جو خط بھیجا گیا، وہ یہ تھا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم .

محمد کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور اُس کا رسول ہے، بنام ہرقل جو روم کا رئیس اعظم ہے۔

جو کوئی ہدایت کی پیروی کرے اُس پر سلامتی ہو، اس کے بعد میں تم کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری قبول کرلو تو سلامت رہو گے، اللہ تعالیٰ تم کو دوگنا اجر دے گا۔ لیکن اگر تم نے اللہ کی فرماں برداری سے منہ موڑا تو تمھارے ملک کے لوگوں کا گناہ بھی تمہارے اوپر ہوگا، کیونکہ تمھارے انکار کی وجہ سے اُن کو بھی اسلامی دعوت نہ پہنچ سکے گی۔

اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے لیکن اگر تم اس بات کو ماننے سے منہ موڑ وتو (ہم صاف کہہ دیتے ہیں کہ) تم گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں (یعنی صرف خدا کی اطاعت اور بندگی کرنے والے'')

ابوسفیان سے مکالمہ:-

حضرت وحیہ کلبی نے یہ خط بصریٰ میں حارث غسانی کو جا کر دیا جو اس وقت قیصر روم کی طرف سے شام میں، حکومت کر رہا تھا۔ اور اس نے اُسے قیصر کے

پاس بھیج دیا۔ قیصر کو خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص ملے تو اُسے پیش کیا جائے۔ اسی زمانے میں ابوسفیان بہ سلسلۂ تجارت اس علاقے میں گئے ہوئے تھے۔ قیصر کے لوگوں نے اُن کو دربار میں پیش کیا۔ اُن سے جو بات چیت ہوئی تھی وہ یہ ہے۔

قیصر :- مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان :- وہ شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

قیصر :- اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان :- نہیں۔

قیصر :- کیا اس خاندان میں کبھی کوئی بادشاہ گذرا ہے؟

ابوسفیان :- کبھی نہیں۔

قیصر :- جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا دولت والے؟

ابوسفیان :- کمزور لوگ ہیں۔

قیصر :- اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جا رہے ہیں؟

ابوسفیان :- برابر بڑھتے جا رہے ہیں۔

قیصر :- کیا تم لوگوں نے اُسے کبھی جھوٹ بولتے بھی پایا ہے؟

ابوسفیان :- کبھی نہیں۔

قیصر :- کیا وہ عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان :- ابھی تک اُس نے کبھی عہد اور اقرار کے خلاف کوئی بات نہیں کی ہے۔ اب ایک نیا معاہدہ ہوا ہے (صلح حدیبیہ) اس میں دیکھنا ہے کہ وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

قیصر :- کیا تم نے کبھی اس سے جنگ بھی کی ہے؟

ابوسفیان :- ہاں کی ہے۔

قیصر :- جنگ کا نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان :- کبھی ہم جیتے اور کبھی اُس کی فتح ہوئی۔

قیصر :- وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان :- وہ کہتا ہے کہ صرف ایک خدا کی بندگی کرو۔ کسی دوسرے کو کسی طرح بھی اس کا ساجھی نہ بناؤ۔ نماز پڑھو۔ پاک دامنی اختیار کرو۔ سچ بولو۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی اور رحمت سے پیش آؤ۔

اس بات چیت کے بعد اس نے کہا کہ ''پیغمبر ہمیشہ اچھے ہی خاندان میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا اس کے خاندان میں نبوت کا دعویٰ کرتا تو ہوسکتا تھا کہ اس کا دعویٰ بھی خاندان کا اثر سمجھا جاتا اور اگر اُس کے خاندان میں کوئی بادشاہ ہوتا تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ شاید حکومت کی ہوس میں وہ یہ سب کچھ کررہا ہو، اور جب یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ اس نے آدمیوں کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس نے خدا کے معاملے میں اتنا بڑا جھوٹ گھڑ لیا ہو (کہ اُسے خدا نے اپنا رسول بنایا ہے) اور یہ بھی واقعہ ہے کہ پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں اور سچا مذہب ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ پیغمبر کبھی کسی سے دھوکا یا فریب نہیں کرتے پھر تم یہ بھی کہتے ہو کہ وہ نماز، پاک دامنی اور تقویٰ کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی دن اس کا قبضہ میری حکومت تک بھی ہو جائے گا۔ مجھے یہ تو

معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔"

قیصر کے یہ خیالات سن کر اس کے درباری، پادری اور علماء سخت ناراض ہوئے اور یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں قیصر کے خلاف بغاوت نہ اٹھ کھڑی ہو۔ اسی اندیشے میں وہ روشنی جو قیصر کے دل میں پیدا ہو رہی تھی، دب کر رہ گئی۔ سچ ہے حق کو قبول کرنے کی راہ میں دولت اور اقتدار ہی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

شاہ ایران کے نام :-

ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کے نام جو خط لکھا وہ یہ تھا۔

"بسم الله الرحمن الرحيم

محمد اللہ کے رسول کی طرف سے بنام کسریٰ رئیس اعظم فارس۔ سلام ہو اُس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ اور یہ کہ میں تمام انسانوں کے لئے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغمبر ہوں تاکہ ہر متنفس کو میں (اللہ کی نافرمانی) کے برے انجام سے ڈرا دوں۔ تم بھی اللہ کی اطاعت و فرماں برداری قبول کرو، تم سلامت رہو گے، ورنہ مجوسیوں کا وبال تمھاری گردن پر ہوگا۔

خسرو پرویز بڑی شان و شوکت کا بادشاہ تھا۔ اس کے نزدیک خط لکھنے کا یہ انداز ہی سخت تکلیف دہ تھا۔ جس میں پہلے خدا کا نام، پھر خط بھیجنے والے کا نام اور پھر بادشاہ کا نام لکھا گیا تھا اور وہ بھی بالکل سادہ طریقے سے۔ نہ وہ القاب و آداب اور نہ وہ انداز تحریر جو اس کے یہاں رائج تھا۔ خسرو پرویز اس خط کو دیکھ کر

جھلا اٹھا اور بولا۔ ''میرا غلام ہو کر مجھے یوں لکھتا ہے۔'' یہ کہہ کر نامہ مبارک پھاڑ ڈالا اور اپنے یمن کے گورنر کو حکم بھیجا کہ اس نبوت کے دعویٰ کرنے والے کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔

یمن کے گورنر نے دو آدمیوں کو خدمت مبارک میں بھیجا کہ آپ کو بلا لائیں۔ اس درمیان خسرو پرویز کے بیٹے نے اُسے قتل کر دیا اور خود تخت کا مالک بن بیٹھا۔ جب گورنر کے بھیجے ہوئے دونوں آدمی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے تو اُنھیں اپنے بادشاہ کے قتل کا حال کچھ معلوم نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات اللہ تعالیٰ کے حکم سے معلوم ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے اِن دونوں آدمیوں کو اس واقعہ کی خبر دی اور فرمایا کہ تم واپس جاؤ اور گورنر سے کہہ دو کہ اسلام کی حکومت خسرو کے دارالسلطنت تک پہنچے گی۔ جب یہ لوگ یمن واپس آئے تو معلوم ہوا کہ واقعی خسرو پرویز کے قتل کی اطلاع درست تھی۔

نجاشی اور عزیز مصر کے نام:-

تقریباً اسی مضمون کا خط حبش کے بادشاہ نجاشی کو بھی بھیجا گیا تھا اس کے جواب میں اس نے لکھا تھا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے سچے پیغمبر ہیں'' نجاشی نے حضرت جعفر کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ جو ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے اور جن کا ذکر اس سے پہلے ہجرت حبش کے ذیل میں آ بھی چکا ہے۔

عزیز مصر اگرچہ خط پڑھ کر اسلام نہیں لایا لیکن اُس نے خط لے جانے والوں کی عزت کی اور اُنھیں تحفے دے کر واپس کیا۔

++

گیارہواں باب

حکومت اسلامی کا استحکام

مدینہ سے جب بنو نضیر کے لوگ نکالے گئے تو وہ خیبر میں آکر آباد ہو گئے۔ خیبر ایک مقام ہے جو مدینہ منورہ سے تقریباً ۲۰۰ میل شمال مغرب کی جانب واقع ہے یہاں یہود نے کئی بڑے مضبوط قلعے بنائے تھے۔

خیبر اس وقت اسلامی تحریک کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز اور اسلام کے لئے ایک مستقل خطرہ تھا۔ خیبر کے یہودی ہی مدینہ پر اس شدید حملے کا سب سے بڑا سبب بنے تھے۔ جس کا ذکر احزاب کی لڑائی کے تحت ہو چکا ہے پھر جب ان کی یہ چال اللہ تعالیٰ نے ناکام فرمادی تو اس کے بعد بھی مسلسل ایسی ریشہ دوانیاں کرتے رہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلامی تحریک کا قلع قمع ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے عرب کے مختلف قبیلوں اور خصوصاً قریش کے ساتھ ساز باز کرنے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے مدینہ کے منافقوں کو بھی اُبھارا اور اُنھیں برابر اس بات کے لئے تیار کرتے رہے کہ اگر وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جڑیں کاٹنے کا کام تیز کر دیں تو پھر باہر کے مخالفین حملہ کر کے اسلام کے خطرے کو ہمیشہ کے لئے مٹا ڈالیں۔ یہود کی یہ ساری کوششیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آتی رہتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوشش کی کہ کسی طرح

یہود سے کوئی مناسب معاہدہ ہو جائے اور وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں چنانچہ اس مقصد کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تحریک بھی فرمائی لیکن یہود اپنی سازشوں سے باز نہ آئے یہاں تک کہ اُنھوں نے مختلف قبیلوں کو یہ پیغام دیا کہ اگر ہمارے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرو تو ہم تمھیں اپنے نخلستان کی آدھی پیداوار ہمیشہ دیا کریں گے غرض کہ یہود کی سازشوں کے نتیجے میں بہت سے قبیلوں کے ارادے غیر ہونے لگے اور وہ اس بات پر متفق ہونے لگے کہ سب مل کر مدینہ پر حملہ کریں۔

خود بڑھ کر وار کرنے کی پالیسی:۔

اب تک مسلمان اپنے بچاؤ کے لئے لڑتے تھے۔ دشمن ان کو ختم کرنے کے لئے ان پر چڑھ کر آئے اور اُنھیں اپنی حفاظت میں ہتھیار اٹھانا پڑے اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شامل حال ہوئی اور دشمن کو نیچا دیکھنا پڑا۔ لیکن اب حالات نے دوسرا رخ اختیار کر لیا تھا اب اس بات کی ضرورت تھی کہ اسلامی تحریک کے لیے جہاں خطرہ اُبھرتا دکھائی دے تو اس سے پہلے کہ وہ خطرہ تحریک کو ختم کر دینے کے لئے پوری طرح منظّم ہو جائے اس پر بڑھ کر خود وار کیا جائے اور اُسے ختم کر دیا جائے اسلامی تحریک کے قیام اور بچاؤ کے لئے جہاں مدافعانہ جنگ کی ضرورت ہے وہاں وقت آنے پر خود بڑھ کر حملہ کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے، مکمل دستور حیات۔ اس نظام اور دستور کو قائم کرنے کے لئے صرف اتنا ہی کام نہیں ہے کہ غیر اسلامی زندگی اور غیر اسلامی دستور حیات کے علم برداروں کی طرف سے جب کوئی حملہ ہو تو صرف اس کا بچاؤ کیا جائے بلکہ اس

دستور حیات کو قائم کرنے کے لئے وہ وقت بھی آتا ہے جب دوسرے نظاموں کو اکھاڑنے کے لئے خود بڑھ کو جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔

جنگ احزاب کے بعد اسلامی تحریک اس دور میں داخل ہوچکی تھی کہ اب صرف دفاعی قسم کی لڑائیاں ہی کافی نہ تھیں بلکہ اب وقت آگیا تھا کہ جب ضرورت پڑے تو خود بڑھ کر خطرے کو دور کیا جائے چنانچہ جنگ احزاب کے ختم ہونے کے بعد آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ ''اب ایسا نہ ہوگا کہ لوگ ہم پر چڑھ کر آئیں گے بلکہ اب ہم خود نکل کر حملہ کریں گے۔[1]

خیبر پر حملہ:-

اب وقت آگیا تھا کہ خیبر کے یہودیوں کے بڑھتے ہوئے فتنے کو بروقت روکا جائے چنانچہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر حملے کی تیاریاں شروع کردیں۔اور یہود کی جانب سے جن حملوں کا اندیشہ تھا ان کو روکنے کے لئے خود مدینے سے نکلے۔ یہ واقعہ محرم ۷ھ کا ہے۔اس حملے کے لئے جو فوج ساتھ تھی اس کی تعداد سولہ تھی۔جن میں دوسو سوار اور باقی پیدل تھے۔

خیبر میں چھ قلعے تھے اور ان میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے۔خیبر پہنچنے پر بھی جب آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین ہوگیا کہ واقعی یہود جنگ ہی کے لئے آمادہ ہیں اور کسی عنوان پر معاہدے یا صلح کے لئے تیار نہیں ہیں تو آپ نے صحابہ کے سامنے جہاد پر ایک خطبہ دیا اور اُنھیں اللہ کے دین کی خاطر جان کی بازی لگانے کی ترغیب دی۔ تقریباً ۲۰ دن کے محاصرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے

[1] موضح القرآن۔شاہ عبدالقادر صاحب۔سورۂ احزاب۔

مسلمانوں کو فتح دی اس جنگ میں ۹۳ یہودی مارے گئے اور ۱۵ر مسلمان شہید ہوئے، یہود کا ایک بڑا پہلوان مرحب حضرت علیؓ کے ہاتھ سے قتل ہوا اس پہلوان کا مارا جانا ایک عظیم الشان واقعہ تھا یہود کو اس کی طاقت پر بڑا ناز تھا۔

فتح کے بعد یہودیوں نے درخواست کی کہ جو زمینیں اب تک ان کے پاس تھیں وہ اگر ان ہی کے قبضے میں چھوڑ دی جائیں تو وہ مسلمانوں کو آدھی پیداوار دیتے رہیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی۔ آئندہ سالوں میں اس نصف پیداوار کو حاصل کرنے کے سلسلے میں مسلمان حاکموں نے جو انصاف کا طریقہ یہود سے برتا اس نے رفتہ رفتہ ان کے دلوں کو بھی جیت لیا مسلمان کم پیداوار کے دو ڈھیر لگا دیتے تھے اور کاشتکار کو یہ حق دیتے تھے کہ وہ جس ڈھیر کو چاہے پسند کرلے۔

مسلم معاشرے کی تربیت:-

جنگ احد کے بعد اسلامی تحریک کے لئے بیرونی خطرات جس پیمانے پر بڑھ چکے تھے اس کا اندازہ جنگ احزاب اور اس کے بعد کے واقعات سے اچھی طرح ہوسکتا ہے یہ زمانہ بڑی کشمکش کا زمانہ تھا لیکن اس کے باوجود تحریک اسلامی کے داعی (صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح ایک ہوشیار جنرل کی حیثیت سے ان واقعات سے نمٹ رہے تھے اسی طرح وہ ایک معلم اخلاق اور مربی ومزکی کی حیثیت سے تحریک کے علم برداروں کی تربیت بھی فرمارہے تھے اور اس نئے اسلامی معاشرے کے لئے جن ضوابط اور قوانین کی ضرورت تھی ان کی تعلیم بھی مسلسل دی جارہی تھی۔ اس دور کی دو اہم صورتوں یعنی سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ

کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اسلامی کردار اور مسلم معاشرہ کی تعمیر کے لئے کیسے کیسے اہم قوانین اور ضوابط کی تعلیم دی گئی۔

سورۂ نساء ۴ھ اور ۵ھ میں مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس نئی اسلامی سوسائٹی کو کس طرح پرانے جاہلی رسم ورواج سے پاک فرما کر اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، کے نئے اُصول پر منظّم فرما رہے تھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت مسلمانوں کو واضح ہدایات دی جارہی تھیں کہ وہ اپنی شخصی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی اجتماعی زندگی کو کس طرح اسلام کے طریقوں پر درست کریں۔ اُنھیں خاندان کی تنظیم کے اصول بتائے گئے۔نکاح اور طلاق کے بارے میں واضح ہدایات دی گئیں۔عورتوں اور مردوں کے حقوق متعین کر کے سماج کی بہت سی خرابیوں کو دور کیا گیا۔ یتیموں اور کمزوروں کے حقوق کی حفاظت کی تاکید کی گئی۔وراثت کی تقسیم کے اصول بنائے گئے۔لین دین کے معاملات کی اصلاح کے لئے ہدایات دی گئیں۔ گھریلو جھگڑوں کی اصلاح کے طریقے بتائے گئے۔شراب پینے پر پابندیاں لگائی گئیں۔ طہارت اور پاکیزگی کے احکام دیئے گئے۔مسلمانوں کو بتایا گیا کہ ایک نیک انسان کا تعلق خدا اور اس کے بندوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ اہل کتاب کے غلط رویوں اور نامناسب طرز زندگی پر تنقید کر کے ایک طرف اہل کتاب پر ان کی غلطیاں واضح کی گئیں اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو یہ سمجھایا گیا کہ وہ اس قسم کی غلطیوں سے بچتے رہیں۔

اسلامی تحریک کا یہی وہ پہلو ہے جس کو درست کیے بغیر اُسے باطل کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسلامی تحریک کے علم برداروں کو نہ صرف اپنی ذاتی حیثیت میں اخلاقی اعتبار سے باطل پرستوں کے مقابلے میں اونچا ہونا چاہیے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک مثالی معاشرہ پیش کریں جو خود زبان حال سے غیر اسلامی معاشرے کے مقابلے میں اپنی برتری ثابت کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کسی اہتمام اور بناوٹ کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ جب تحریک کے علم برداروں میں تقویٰ اور احسان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو پھر یہی نتائج برآمد ہونے لگتے ہیں۔ ایک نبی کی اصلاحی اور انقلابی تحریک اسی اعتبار سے دوسری تمام تحریکوں سے ممتاز ہوتی ہے نبی اپنے پیروؤں کی تعلیم، تربیت اور تزکیہ کی طرف اس سے کہیں زیادہ توجہ فرماتا ہے، جتنا وہ اپنے مخاطبین میں دعوت کا حق ادا کرنے کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ یہ امتیازی خصوصیت خود سورۂ نساء کے مضامین میں بھی موجود ہے۔ سورہ میں جہاں اخلاق، تمدن اور معاشرت کے بارے میں قوانین بیان ہورہے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ دعوت وتبلیغ کا پہلو بھی سامنے ہے اور مشرکین اور اہلِ کتاب کو برابر دینِ حق کی طرف دعوت دی جارہی ہے۔

صلح حدیبیہ کے بعد تقریباً سن ۷ ھ میں سورہ مائدہ نازل ہوئی۔ حدیبیہ کے صلح نامہ کی رو سے مسلمان اس سال عمرہ نہیں کر سکے تھے بلکہ یہ بات طے ہوگئی تھی کہ آپ آئندہ سال کعبے کی زیارت کے لئے آئیں گے چنانچہ اس مرحلے سے پہلے کعبے کی زیارت کے سلسلے میں بہت سے آداب بتائے گئے

اور اُنھیں یہ تعلیم دی گئی کہ کافروں کی زیادتی کے باوجود مسلمان اپنی طرف سے کوئی زیادتی نہ کریں۔

جس زمانے میں سورہ مائدہ نازل ہوئی اس وقت تک مسلمانوں کی حالت کافی بدل چکی تھی اب وہ وقت نہیں تھا کہ اسلام کو چاروں طرف سے خطرے ہی خطرے گھیرے ہوئے ہوں جیسا کہ جنگ احد کے بعد کیفیت تھی بلکہ اب صورت حال یہ تھی کہ اسلام کی اپنی ایک طاقت تھی اور اسلامی ریاست کافی پھیل چکی تھی۔ مدینہ کے چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو میل تک تمام مخالف قبیلوں کا زور ٹوٹ چکا تھا اور مدینے کو یہودیوں سے جو ہر وقت کا خطرہ تھا اس کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا۔ جہاں کہیں یہودی باقی بھی تھے وہ سب مدینے کی ریاست کی ماتحتی قبول کر چکے تھے۔ غرض یہ کہ اب صاف نظر آنے لگا تھا کہ اسلام محض چند عقائد کا مجموعہ ہی نہیں ہے جسے عام اصطلاح میں ''مذہب'' کہا جائے اور جس کا تعلق صرف انسانوں کے دل اور دماغ سے ہی ہو بلکہ وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے جس کا تعلق انسان کے دل اور دماغ کے علاوہ اس کی پوری زندگی سے ہے۔ جس میں حکومت اور سیاست، صلح اور جنگ سب کچھ شامل ہے پھر یہ بھی واضح تھا کہ اب مسلمان اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ اُنھوں نے جس نظام زندگی یعنی دین کو سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا اس پر خود بھی بلا کسی روک ٹوک کے زندگی بسر کر سکیں۔ اور کوئی دوسرا نظام زندگی یا قانون ان کا راستہ نہ روک سکے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اس دین کی طرف دوسروں کو دعوت بھی دے سکیں۔

اس وقت تک مسلمانوں کی اپنی ایک تہذیب بن چکی تھی جو دوسروں سے

ممتاز ہوتی جارہی تھی۔ ان کے اخلاق، ان کے رہنے سہنے کے طریقے، ان کے معاملات غرض یہ کہ ان کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اسلامی اصولوں کے تحت ڈھلتا جارہا تھا اور اب وہ دوسروں کے مقابلے میں بالکل کھلی ہوئی امتیازی حیثیت اختیار کرچکے تھے۔ ان کے اپنے دیوانی اور فوجداری کے قوانین تھے۔ اپنی عدالتیں تھیں۔ لین دین اور خرید وفروخت کے اپنے طریقے تھے۔ وراثت کا ایک مستقل قانون تھا۔ طلاق، نکاح، پردہ اور اسی قسم کے دوسرے معاملات کے لیے ان کے اپنے قوانین اور ضابطے تھے۔ انتہا یہ کہ ان کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، ملنے جلنے کے آداب کے بارے میں بھی واضح ہدایات موجود تھیں اور ان تمام چیزوں نے مل کر اسلامی معاشرے اور اسلامی طریقۂ زندگی کو دوسرے تمام غیر اسلامی معاشروں سے ممتاز بنا دیا تھا اور یہ سب اس تربیت اور تعلیم کا نتیجہ تھا جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری توجہ فرمارہے تھے اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی زندگیاں پاکیزہ سے پاکیزہ تر ہوتی جارہی تھیں۔

سورہ مائدہ میں سفرِ حج کے آداب، کھانے پینے کی چیزوں میں حرام اور حلال کی تمیز، وضو، غسل اور تیمّم کے قاعدے، شراب اور جوئے کی حرمت، قانون شہادت کے بارے میں ہدایات اور عدل وانصاف پر قائم رہنے کی تاکید وغیرہ ایسے موضوع ملتے ہیں جو اسلامی معاشرے کی تعمیر کے لئے ازبس ضروری تھے اور ان سب کی طرف پوری توجہ دی جارہی تھی۔

ادائے عمرہ:-

حدیبیہ کے صلح نامہ کی ایک شرط یہ تھی کہ مسلمان اگلے سال آکر عمرہ

کرسکیں گے۔ چنانچہ اگلے سال یعنی ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ کعبے کی زیارت کی۔ اس موقع پر صحابہ پر مسرت اور جوش کی ایک عجیب کیفیت طاری تھی اس منظر نے کفار قریش کے دلوں میں دبی ہوئی حسد اور تعصب کی آگ کو اور بھڑکا دیا اور اب اُنھیں اپنا وہ صلح نامہ جس میں اُنھوں نے اپنی خواہش کے مطابق اپنا پلہ بھاری رکھا تھا، ہیچ نظر آنے لگا۔

فتح مکہ

صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی:-

حدیبیہ کے صلح نامہ کی رو سے عرب کے قبیلوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں یا قریش جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کرلیں۔ چنانچہ اسی شرط کی بنا پر قبیلہ خزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرلیا تھا اور قبیلہ بنوبکر قریش کا ساتھی بن گیا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک تو اس معاہدے پر پوری طرح عمل ہوتا رہا لیکن اس کے بعد ایک نیا واقعہ پیش آیا کہ خزاعہ اور بنوبکر کے قبیلے جو عرصہ سے آپس میں لڑتے رہے تھے ان کے درمیان پھر لڑائی چھڑ گئی جس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ بنوبکر نے خزاعہ پر چڑھائی کردی اور قریش نے بنوبکر کی امداد کی کیونکہ وہ پہلے ہی اس بات پر خزاعہ سے ناراض تھے کہ اُنھوں نے ان کی مرضی کے خلاف مسلمانوں سے کیوں معاہدہ کیا تھا غرض یہ کہ دونوں نے مل کر قبیلہ خزاعہ کے لوگوں کو قتل کرنا شروع کردیا یہاں تک کہ جب اُنھوں نے خانۂ کعبہ میں پناہ لی تو وہاں بھی ان کو نہ چھوڑا اور حرم میں بھی خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

خزاعہ نے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حالات سے باخبر کیا اور اس معاہدے کی بنیاد پر جو اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا مدد کے طلب گار ہوئے آپ نے جب خزاعہ کی مظلومی کا حال سنا تو آپ کو سخت صدمہ ہوا اور آپ نے قریش کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ وہ اپنی حرکت سے باز آئیں اور اِن شرطوں میں سے کسی ایک کو قبول کر لیں۔

۱-خزاعہ کے جو لوگ مارے گئے ہیں ان کا خون بہا ادا کیا جائے۔ یا

۲-قریش بنو بکر کی حمایت نہ کریں۔ یا پھر

۳-اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا صلح نامہ ختم ہو گیا۔

قاصد کے ذریعہ یہ پیام سن کر قریش میں سے ایک شخص قرطہ بن عمر نے کہا کہ ''ہمیں صرف تیسری شرط منظور ہے۔'' قاصد کے چلے جانے کے بعد اُنھیں افسوس ہوا اور اُنھوں نے پھر اپنی طرف سے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ حدیبیہ کے صلح نامہ کی تجدید کرا لائیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حالات معلوم ہو چکے تھے ان کی بنیاد پر قریش کے اب تک کے رویے کے پیش نظر ان کی اس بات پر اطمینان نہ ہوا اور آپ نے ابوسفیان کی بات منظور نہ فرمائی۔

مکے پر حملے کی تیاری:-

خانۂ کعبہ توحید خالص کا وہ مرکز تھا جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خالص خدا کی عبادت کے لئے تعمیر فرمایا تھا لیکن وہ ابھی تک مشرکوں کے قبضے میں تھا اور شرک کا سب سے بڑا گڑھ بنا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے داعی تھے اور خالص توحید کے علم بردار۔ اس اعتبار سے

لازم تھا کہ توحید کے اس مقدس مرکز کو شرک کی تمام گندگیوں سے جلد سے جلد پاک کیا جائے۔ لیکن ابھی تک حالات نے اس کی اجازت نہیں دی تھی مگر اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اندازہ فرمالیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اللہ کے اس مقدس گھر کو صرف اسی کی عبادت کے لئے مخصوص کرلیا جائے اور بت پرستی کی تمام ناپاکیوں سے اس گھر کو پاک کردیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام قبیلوں کے پاس پیغام بھیجے جن سے معاہدے تھے اور اس بات کی احتیاط فرمائی کہ مکے والوں کو اس تیاری کی خبر نہ ہونے پائے جب سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ رمضان سن ۸ھ کو مکے کی طرف کوچ فرمایا تقریباً دس ہزار جاں نثاروں کا نہایت شان دار لشکر ساتھ تھا اور راستے میں عرب کے دوسرے قبیلے بھی آکر ملتے جاتے تھے۔

ابوسفیان کی گرفتاری:-

اسلامی لشکر جب مکے کے پاس پہنچا تو ابوسفیان جو چھپ کر لشکر کا اندازہ کررہے تھے، گرفتار کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیے گئے یہ وہی ابوسفیان ہیں جو اب تک اسلام کی مخالفت میں بہت پیش پیش تھے اُنھوں نے ہی بار بار مدینے پر حملے کی سازشیں کی تھیں یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرانے کی خفیہ تدابیر بھی کی تھیں۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ ابوسفیان کو فوراً ہی قتل کرادینا چاہیے تھا لیکن آنحضرتؐ نے ان پر مہربانی کی نظر ڈالی اور فرمایا کہ "جاؤ آج تم سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی۔ اللہ تمھیں معاف کرے وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔"

ابوسفیان کے ساتھ یہ معاملہ بالکل ہی انوکھا معاملہ تھا۔ رحمتہ للعالمین کی اس رحمت نے ابوسفیان کے دل کی آنکھیں کھول دیں اور اُنھیں یہ معلوم ہوگیا کہ مکے پر فوج لے کر آنے والا نہ تو اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لئے ان کے خون کا پیاسا ہے اور نہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح مغرور و متکبر ہے یہی وجہ تھی کہ اگرچہ آنخضرتؐ نے ابوسفیان کو آزاد کر دیا لیکن وہ مکے واپس نہ گئے بلکہ اسلام قبول کر کے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں میں شامل ہو گئے۔

مکے میں داخلہ:-

اب آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو حکم دیا کہ تم مکے کی ایک جانب سے داخل ہو لیکن کسی کو قتل نہ کرنا ہاں اگر کوئی تم پر ہاتھ چھوڑے تو اپنے بچاؤ میں تمھیں بھی ہاتھ اُٹھانے کی اجازت ہے اور خود آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسری جانب سے داخل ہوئے۔ حضرت خالد کی فوج کے مقابلے میں کچھ قریش قبیلوں نے تیر برسائے اور مسلمانوں کے تین افراد کو شہید کر دیا۔ اسی لئے حضرت خالد کو بھی مقابلہ کرنا پڑا اور حملہ کرنے والوں کے ۱۳/افراد قتل ہوئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حضرت خالد کے حملے کی خبر ہوئی تو آپ نے ان سے باز پرس کی۔ لیکن جب اصل واقعہ معلوم ہوا تو فرمایا۔ ''قضائے الٰہی یہی تھی۔'' دوسری طرف سے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں بلا کسی مزاحمت کے داخل ہوئے اور آپ کے لشکر کے ہاتھوں کوئی قتل نہ ہوا۔

مکے میں امن کا اعلان:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں داخل ہوتے ہی اعلان فرما دیا کہ:-

۱- جوکوئی اپنے مکان کے اندر کواڑ بند کر کے بیٹھ رہے اُسے امن ہے۔

۲- جو ابوسفیان کے مکان میں داخل ہو جائے اُسے بھی امن ہے۔

۳- اور جوکوئی خانۂ کعبہ میں پناہ لے اُسے بھی امن ہے۔

لیکن اس عام امن کے اعلان سے ایسے چھ یا سات آدمیوں کو مستثنٰی فرما دیا تھا جو اسلام کی مخالفت میں بہت پیش پیش تھے اور جن کا قتل کر دینا ہی ضروری تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کا عَلَم سفید رنگ کا تھا اور پرچم سیاہ رنگ کا۔ سر پر مغفر اوڑھے ہوئے تھے اور اس پر سیاہ عمامہ بندھا تھا۔ سورۂ "انا فتحنا" بلند آواز سے تلاوت فرما رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں خشوع وخضوع کا یہ عالم تھا کہ جس اونٹ پر آپ سوار تھے اس پر آپ اس قدر جھکے ہوئے تھے کہ چہرۂ مبارک اونٹ کی پیٹھ پر لگ جاتا تھا۔

خانۂ کعبہ میں داخلہ:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد حرام (کعبے) میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے حکم دیا کہ تمام بت نکال کر پھینک دیے جائیں۔ اس وقت کعبے میں ۳۶۰/ بت موجود تھے۔ دیواروں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں یہ بھی سب مٹائی گئیں اور اس طرح اللہ کے اس گھر کو شرک کی گندگی سے

پاک کیا گیا اس کے بعد آپ نے تکبیریں کہیں، خانہ کعبہ کا طواف فرمایا اور مقام ابراہیم پر جا کر نماز ادا کی۔ بس یہ تھا فتح کا جشن جسے دیکھ کر مکے والوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُنھوں نے دیکھا کہ ایک ایسی خوشی اور ایسی زبردست فتح کے موقع پر بھی ان لوگوں میں نہ شان وشوکت کا اظہار ہے اور نہ غرور وتکبر کی باتیں بلکہ انتہائی عاجزی اور شکر کے ساتھ یہ اُپنے خدا کے سامنے جھکے جاتے ہیں۔ اور اسی کی حمد اور تکبیر میں مست ہیں۔ کون تھا جو اس منظر کو دیکھ کر یہ نہ کہہ اٹھتا کہ حقیقت میں یہ نہ بادشاہی ہے اور نہ ملک گیری بلکہ یہ کچھ اور ہی ہے۔

فتح کے بعد خطبہ:-

فتح مکہ کی تکمیل کے بعد آپؐ نے ایک نہایت اہم تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس کے کچھ حصے احادیث میں نقل ہوئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:-

"ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے اس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا۔ ہاں سن لو تمام مفاخر، تمام پرانے قتل اور خون کے بدلے اور تمام خوں بہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں صرف کعبے کی تولیت اور حجاج کو پانی پلانا اس سے مستثنیٰ ہیں اے اہل قریش! اب خدا نے جاہلیت کا غرور اور نسب پر فخر کرنا مٹا دیا تمام لوگ آدمؑ کی نسل سے ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔"

پھر قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:-

''لوگو! میں نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے قبیلے اور خاندان بنائے تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ۔ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

(حجرات۔۲۰)

اس کے ساتھ ہی چند دوسرے ضروری مسائل کی بھی تلقین کی۔

یہ ہے اُس تقریر کا انداز جو اسلام کے فاتح اعظم نے اپنی سب سے بڑی فتح کے بعد کی۔ اس میں مخالفوں کے خلاف نہ کوئی غصہ ہے نہ نفرت، نہ اپنے کارناموں کا ذکر ہے اور نہ اپنے جانثاروں کی تعریف۔ تعریف جو کچھ ہے وہ بس ایک اللہ کے لئے ہے جو کچھ ہوا وہ سب اسی کے فضل کا نتیجہ ہے۔

عرب میں قتل کا بدلہ لینے کی بڑی اہمیت تھی خاندان کا کوئی شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تو اسی خاندان کی یادداشت میں اس واقعہ کو محفوظ کر دیا جاتا اور برسوں کے بعد بھی آنے والی نسلیں جب تک قاتل کے خاندان سے مقتول کا بدلہ نہ لے لیتیں۔ انھیں چین نہ آتا۔ اس موقع پر آپ نے ایسے تمام خون کے بدلوں کو ختم کر دیا۔ یوں کہیے کہ عرب کو صحیح معنوں میں ایک امن اور چین کی زندگی عنایت فرما دی پھر عربوں میں خاندان اور نسل پر فخر کرنا ایک بہت پرانی بیماری تھی۔ اسلام کے نزدیک انسان اور انسان میں کوئی امتیاز اس کے سوا درست نہیں ہے کہ کون اللہ کے احکام کا کس درجہ میں اطاعت گذار ہے، جو جتنا اللہ کے

احکام کا پابند اور اس کی خوشی سے ڈرنے والا ہے وہ اتنا ہی بزرگ اور شریف ہے۔ نسل کی شرافت اسلام میں کوئی چیز نہیں ہے خاندانوں کا تعلق صرف ایک دوسرے کے تعارف کے لئے ہے۔ اللہ کے رسول نے اس موقع پر اس بیماری کو بھی ختم فرما دیا اور تمام انسانوں کے درمیان اس مساوات کا اعلان فرما دیا جو آج تک اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب نے انسانوں کو نہیں دی ہے۔

عام معافی:-

جس مجمع کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اس میں قریش کے بڑے بڑے سرکش موجود تھے۔ وہ بھی تھے جنھوں نے اسلام کو مٹانے کا بیڑا اٹھایا تھا وہ بھی تھے جنھوں نے مسلمانوں کو اتنا ستایا تھا کہ وہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے، وہ بھی تھے جنھوں نے مسلمانوں کی جائدادوں پر قبضہ کرلیا تھا اور وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی تھیں آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے۔ آپ پر کوڑے کے ٹوکرے ڈالے تھے اور انتہا یہ کہ آپ کے قتل کے درپے ہوئے تھے ان ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے وہ قاتل بھی تھے جو اُن کا کلیجہ نکال کر چبا گئے تھے اور وہ بھی تھے جنھوں نے بہت سے مسلمانوں کو صرف اسی لیے قتل کیا تھا کہ وہ ایک خدا کی بندگی کا اعلان کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ ''کہو، آج تم جانتے ہو کہ اب میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟'' یہ لوگ دیکھ چکے تھے کہ اللہ کے رسول نے مکے میں کس طرح قدم رکھا ہے اور ان کا اب تک کا رویہ کیا رہا ہے۔ فوراً بول اٹھے کہ:-

''آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے۔''

یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

''جاؤ آج تم پر کوئی الزام نہیں، تم سب آزاد ہو۔''

جن لوگوں نے مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے مکانات پر قبضہ کرلیا تھا۔ آپؐ نے ان کو بھی واپس نہیں کرایا۔ بلکہ مہاجروں سے فرمایا کہ وہ اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غیر معمولی برتاؤ کا یہ اثر ہوا کہ بڑے بڑے سرکش قدموں میں تھے اور اُنھوں نے اعلان کر دیا کہ واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ملک فتح کرنے والے بادشاہ نہیں ہیں اور آپ جو دعوت دیتے ہیں وہی حق ہے۔

یہ تھا فتح مکہ کا نقشہ۔ یہ فتح زمین جائداد اور مال پر فتح نہ تھی بلکہ اس کے ذریعہ دلوں کو جیت لیا گیا تھا اور یہی بڑی فتح تھی۔

غزوۂ حنین

فتح مکہ کا اثر:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رحیمانہ برتاؤ اور مسلمانوں کے میل جول سے ایک طرف تو مکے میں لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے اور دوسری طرف مکہ فتح ہونے کا اثر تمام عرب قبیلوں پر یہ پڑا کہ اُنھوں نے سمجھ لیا کہ واقعی اسلام کی طرف دعوت دینے والا کوئی حکومت اور دولت کا بھوکا نہیں ہے بلکہ اللہ کا پیغمبر ہی ہے، پھر اس وقت تک اسلام اور اس کی خصوصیات کوئی ڈھکی چھپی چیز نہ

رہ گئی تھیں بلکہ تقریباً تمام عرب جان گیا تھا کہ یہ دعوت کیا ہے اور جن لوگوں کے دلوں میں صلاحیت تھی وہ جانتے تھے کہ حق یہی ہے چنانچہ مکہ فتح ہوتے ہی عرب کے گوشے گوشے سے مختلف قبیلوں کے وفود آنے لگے اور اسلام قبول کرنے لگے۔ یہ صورت حال ایسی تھی کہ ابھی جن لوگوں کے دلوں میں اسلامی تحریک کے خلاف نفرت اور غصہ موجود تھا وہ اس کیفیت کو دیکھ کر انتہائی بے چین ہو گئے ان کے اندر تعصب اور مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس اعتبار سے ہوازن اور ثقیف نامی دو قبیلے پیش پیش تھے۔ یہ ویسے بھی بہت لڑنے والے لوگ تھے اور اسلام کی ترقی دیکھ کر انتہائی بے چین تھے۔ اُنھوں نے سمجھ لیا کہ مکے کے بعد اب ان کی باری ہے۔ دونوں قبیلوں کے سرداروں نے مل کر مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ جو کچھ بھی ہو مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور اس بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنا چاہیے ورنہ پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ اُنھوں نے اپنے ایک سردار مالک ابن عوف نضری کو اپنا بادشاہ بنایا اور مسلمانوں سے نمٹنے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں اُنھوں نے اور بھی بہت سے قبیلوں کو اپنا ساتھی بنالیا۔

معرکہ حُنین:-

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو آپ نے بھی صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا اور یہ طے پایا کہ اس بڑھتے ہوئے فتنے کو بھی بروقت دبا دینے کی کوشش ضروری ہے چنانچہ ۱۰ رشوال ۸ھ کو تقریباً ۱۲ ر ہزار مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ آپ دشمن کے مقابلے کیلئے روانہ ہوئے اس وقت اسلامی لشکر اتنی زیادہ تعداد میں تھا اور سروسامان اتنا کافی تھا کہ اُسے دیکھ کر پورا یقین ہوتا تھا کہ دشمن

مقابلے کی تاب نہ لا سکے گا اور فوراً ہی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ چنانچہ بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ الفاظ بھی نکل گئے کہ ''آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے'' لیکن یہ خیال مسلمان کی شان سے بعید ہے اُسے کسی موقع پر بھی اپنی طاقت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اس کی طاقت اور اس کا بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہی ہونا چاہیے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

حُنین کا دن یاد کرو جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے لیکن وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت کے اس دن تمھارے لیے تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اپنی طرف سے تسلی اور اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور کافروں کو عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے۔

(سورۂ توبہ۔آیت ۲۶،۲۵)

حُنین مکے اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے، اسی مقام پر یہ جنگ ہوئی۔ جب اسلامی لشکر دشمن کے سامنے آیا تو اُنھوں نے اِردگرد کی پہاڑیوں سے بے تحاشہ تیر برسانے شروع کردیے مسلمان اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ ان تیروں کی وجہ سے ان کی صفیں بگڑ گئیں اور تھوڑی دیر کے لئے ان کے قدم اکھڑ گئے۔ بہت سے بدوی قبائل بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں بہت سے لوگ وہ تھے جو ابھی ایمان لائے تھے اور ابھی ان کی تربیت مکمل نہیں ہوئی

تھی۔اس بھگدڑ کی حالت میں آنحضرتؐ نہایت اطمینان کے ساتھ میدان جنگ میں جمے رہے اور برابر مسلمانوں کو پکارتے رہے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کریں اور میدان سے منہ نہ موڑیں۔آپ کے استقلال اور آپ کے گرد بہت سے مخلص صحابہ کی ثابت قدمی کو دیکھ کر مسلمانوں کے قدم پھر سے جمنا شروع ہو گئے اور پھر ہر ایک نے پوری جواں مردی اور بہادری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ شروع کیا۔اللہ تعالیٰ نے نبی کریم اور صحابہ کرام کی اسی ثابت قدمی کو اپنی طرف سے نازل کی ہوئی سکینت (اطمینان اور سکون کی کیفیت) فرمایا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے فضل سے تھوڑی ہی دیر میں لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمانوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی کافروں کے تقریباً ستر آدمی قتل ہوئے اور ہزاروں قید ہوئے۔

دشمن کا تعاقب اور دعائے خیر:۔

کافروں کی باقی فوجوں نے بھاگ کر طائف میں پناہ لی۔یہ ایک محفوظ مقام سمجھا جاتا تھا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کا پیچھا کیا اور طائف کا محاصرہ کرلیا۔طائف میں ایک مشہور اور مضبوط قلعہ بھی تھا جس میں کافروں نے پناہ لی تھی۔محاصرہ تقریباً بیس روز تک جاری رہا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ دشمن کی اصل طاقت ٹوٹ چکی ہے اور اب اس کی طرف سے کسی سرکشی کا اندیشہ نہیں ہے تو آپ نے محاصرہ اٹھالیا اور ان کے حق میں یہ دعا فرمائی "اے اللہ! ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ وہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔" سوائے خدا کے نبی کے جو محض دین کی خاطر کشمکش کر رہا ہو۔کون اتنا رحیم اور شفیق ہو سکتا ہے کہ ایسے موقعہ پر بھی اپنے مخالفوں کے لئے دعا کرے۔

غزوۂ تبوک

سلطنت روم سے کشمکش:-

عرب کے شمال میں روم کی بڑی سلطنت تھی۔ اس سلطنت کے ساتھ کشمکش تو مکہ فتح ہونے سے پہلے ہی شروع ہوگئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفد اسلام کی دعوت لے کر شمال کی طرف ان قبائل کے پاس بھی بھیجا تھا جو شام کی سرحد کے قریب آباد تھے یہ لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیر اثر تھے۔ ان لوگوں نے اسلامی وفد کے پندرہ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور صرف وفد کے رئیس حضرت کعب بن عمر غفاری بچ کر واپس آئے تھے اس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بصریٰ کے رئیس شرجیل کے نام بھی دعوت اسلام کا پیغام بھیجا تھا مگر اس نے بھی آپ کے ایلچی حضرت حارث بن عمیر کو قتل کر دیا تھا۔ یہ رئیس بھی قیصر روم کے احکام کے ماتحت تھا۔ ان ہی اسباب کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں تین ہزار مسلمانوں کی ایک فوج شام کی سرحد کی طرف بھیجی تھی تا کہ اس علاقے میں اب پھر مسلمانوں کو بالکل کمزور سمجھ کر تنگ نہ کیا جائے۔ جب اس فوج کی آمد کی اطلاع شرجیل کو ملی تو وہ تقریباً ایک لاکھ فوج ساتھ لے کر مقابلے کے لئے نکلا۔ لیکن مسلمان اس اطلاع کے باوجود آگے بڑھتے رہے۔ قیصر روم اس وقت حمص کے مقام پر موجود تھا۔ اس نے بھی اپنے بھائی تھیوڈور کے ساتھ ایک لاکھ مزید فوج بھیج دی مگر مسلمان برابر آگے بڑھتے رہے اور آخر کار موتہ کے مقام پر یہ تین ہزار

سرفروش اتنی بڑی رومی فوج سے ٹکرا گئے۔ بظاہر حالات اس اقدام کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کی یہ تھوڑی سی جماعت اتنے کثیر لشکر کے مقابلے میں بالکل ختم ہو جاتی لیکن اللہ کا فضل ایسا ہوا کہ رومیوں کی اتنی بڑی فوج بھی ان مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ یہ واقعہ ایسا تھا کہ اس نے آس پاس کے تمام قبیلوں پر مسلمانوں کی ایک قسم کی دھاک بٹھادی اور دور دور تک بسنے والے قبیلے بھی اسلام کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان میں سے ہزاروں آدمی مسلمان ہو گئے۔

سب سے زیادہ اثر ڈالنے والا واقعہ یہ ہوا کہ خود رومی فوج کے ایک کمانڈر فروہ بن عمرو الجذامی نے اسلام کی تعلیمات پر توجہ کی اور وہ مسلمان ہو گئے اور پھر اُنھوں نے اپنے ایمان کا ایسا زبردست ثبوت دیا کہ جب قیصر نے اُنھیں گرفتار کر کے ان سے کہا کہ یا تو اسلام چھوڑ کر پھر اپنے عہدے پر بحال ہو جاؤ نہیں تو قتل کے لئے تیار رہو تو اُنھوں نے عہدے اور منصب پر لات ماردی اور کہہ دیا کہ وہ آخرت کی کامیابی کے مقابلے میں دنیا کی سرداری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں چنانچہ اُنھیں قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ایسا تھا کہ اس سے ہزاروں آدمیوں کو اسلام کی اخلاقی طاقت اور اس کی واقعی اہمیت کا اندازہ ہوا اور اُنھوں نے جان لیا کہ اس نئی تحریک کا جو سیلاب ان کی طرف بڑھ رہا ہے اس کا مقابلہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

قیصر کی طرف سے حملے کی تیاری:-

دوسرے ہی سال قیصر نے مسلمانوں کو غزوۂ موتہ کی سزا دینے کے لئے شام کی سرحد پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور اپنے ماتحت عرب قبیلوں سے فوجیں

اکٹھی کرنے لگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان تیاریوں کا حال معلوم ہوا۔ یہ موقع اسلامی تحریک کے لئے بڑا نازک تھا اس وقت اگر ذرا بھی سستی دکھائی جاتی تو سارا کام خراب ہو جاتا۔ ایک طرف تو عرب کے وہ سب قبیلے پھر سر اٹھاتے جنہیں ابھی ابھی مکے اور حنین کی جنگ میں شکست اٹھانا پڑی تھی۔ دوسری طرف مدینے کے منافق جو برابر اسلام کے دشمنوں سے سازباز رکھتے تھے عین وقت پر اسلامی جماعت کے اندر ایسا فساد برپا کرتے کہ پھر تحریک اور تنظیم کا سنبھالنا بڑا دشوار ہو جاتا۔ ایسے حالات میں روم کی سلطنت کے بھرپور حملے کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہ ہوتی اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ ان تین حملوں کی تاب نہ لا کر اسلامی تحریک کفر کے مقابلے میں شکست کھا جاتی، یہی وجوہ تھیں جن کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بے مثال خداداد بصیرت سے کام لے کر بلا تامل یہی فیصلہ فرمایا کہ اس موقع پر قیصر کی عظیم الشان طاقت سے ٹکر لینا ہی مناسب ہے کیونکہ اس موقع پر ذرا سی بھی کمزوری دکھانے سے سب بنا بنایا کام بگڑ جاتا۔

مقابلہ کرنے کا فیصلہ:-

مسلمانوں کے لئے اس وقت کسی جنگی تیاری کے لئے آمادہ ہو جانا ایک بڑا سخت امتحان تھا، ملک میں قحط سالی تھی، سخت گرمی کا موسم تھا۔ فصلیں پکنے کے قریب تھیں اور جنگی سامان بھی مکمل نہ تھا، دور دراز کا سفر تھا اور مقابلہ بھی ایک بہت زبردست طاقت سے تھا ان حالات کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے موقع کی نزاکت کا اندازہ فرمانے کے بعد جنگ کا اعلان عام کر دیا اور

صاف صاف بتادیا کہ کہاں جانا ہے اور کس لئے جانا ہے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس وقت تک اسلامی تحریک کا مقابلہ کھل کر بیرونی دشمنوں سے ہورہا تھا اور مکے اور حنین کی لڑائی کے بعد اس مخالفت کا زور ٹوٹ چکا تھا لیکن اس وقت تک اندرونی دشمنی یعنی منافقوں کے ساتھ زیادہ تر معاملہ درگزر کا برتا گیا تھا اور یہ اس لئے تھا کہ ابھی تک تحریک اتنی مستحکم نہیں ہوئی کہ ایک ہی وقت میں باہر کے اور گھر کے دشمنوں سے لڑائی مول لی جاتی دوسرے یہ کہ منافقوں میں سب ایک ہی طرح کے لوگ نہ تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو یا تو کمزوریِ ایمان میں مبتلا تھے یا کچھ شکوک اور شبہات رکھتے تھے ایسے لوگوں کو ایک مناسب مدت تک مہلت دینا ضروری تھا تا کہ وہ اپنی کمزوری اور اپنے شکوک وشبہات دور کرلیں اور آخر میں صرف وہی لوگ باقی رہ جائیں جو جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر اسلام کی جڑیں کاٹنے کے لئے مسلمانوں کے اندر گھس آئے تھے چنانچہ ایک عرصہ تک ایسے لوگوں کو نرم اور گرم ہر انداز میں سمجھانے کی کوشش ہوتی رہیں اور اس کے نتیجے میں جن لوگوں کے اندر کچھ بھی صلاحیت تھی وہ سیدھے راستے پر آتے چلے گئے۔ اب یہ سب مرحلے طے ہو چکے تھے۔ مسلمانوں نے ملک کے اندر اپنے مخالفوں کو بڑی حد تک زیر کرلیا تھا اور اب ان کا مقابلہ ملک کی باہر کی طاقتوں سے شروع ہورہا تھا۔ ایسے نازک موقعوں پر گھر کے اندر کے دشمنوں کا سر کچلنا بہت ضروری تھا ورنہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ باہر کے دشمنوں سے ساز باز کر کے معلوم نہیں کس وقت کیا نقصان پہنچادیں۔

منافقت کا پردہ فاش:-

منافقوں سے نمٹنے کے لئے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ سب لوگ کھل کر سامنے آجائیں اور اُنھوں نے جو اپنے چہروں پر ایمان اور اسلام کی نقاب ڈال رکھی ہے وہ ہٹ جائے اور ان کی اصل حیثیت پوری اسلامی سوسائٹی کو معلوم ہوجائے۔ ان کے لئے پھر یہ موقع باقی نہ رہے کہ یہ مسلمانوں کے معاملات میں مسلمان بن کر دخل دیتے ہیں اور اُنھیں مسلمانوں میں وہی مقام اور درجہ حاصل رہے جو مخلص مسلمانوں کو حاصل ہے۔ چنانچہ جنگ تبوک کا یہ اعلان منافقوں کو بے نقاب کرنے میں نہایت کارگر ثابت ہوا۔ اس موقع پر وہ سب لوگ جو اپنے ایمان کے دعوے میں مخلص تھے دل و جان سے جہاد کے لئے تیار ہوگئے۔ سرمایہ کی ضرورت سامنے آنے پر ان کے پاس جو کچھ تھا لاکر حاضر کردیا اور جب سواری کا انتظام مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سے کچھ لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کا موقع نہ ملا تو وہ اس محرومی پر رو دیے اور اس طرح صاف معلوم ہوگیا کہ اسلامی جماعت میں کتنے لوگ مخلص ہیں لیکن ان کے برخلاف جن لوگوں کے دلوں میں ایمان نہیں تھا، جنگ کا اعلان سن کر گویا ان کی جان ہی نکل گئی۔ ان لوگوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے بنانے شروع کیے اور جنگ پر نہ جانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت حاصل کرنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس موقع پر نرم رویہ اختیار فرمایا اور ایسے تمام لوگوں کو رخصت دے دی۔ پھر ان منافقوں نے اتنا ہی نہیں کیا کہ خود جنگ پر جانے سے جان چرائی بلکہ یہ دوسروں کو بھی روکتے

اور ورغلاتے رہے کبھی کہتے کہ گرمی بہت سخت ہے ایسے میں جنگ کے لیے جا کر کیا جان دینا ہے کبھی کہتے کہ بھلا روم کی سلطنت کے مقابلے میں یہ تھوڑے سے مسلمان کیا کر سکیں گے۔ یہ تو جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ غرض یہ کہ یہ اعلان جنگ ایک ایسا امتحان ثابت ہوا جس میں مخلص مومنین اور منافق کھل کر سامنے آ گئے اور اب یہ ممکن ہو گیا کہ ایسے لوگوں کے خلاف جو مناسب کارروائی ہو وہ کی جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک سے واپسی پر اس کا جو انتظام فرمایا اس کا ذکر آئندہ موقع پر آئے گا۔

تبوک کے لئے روانگی:۔

غرض آپ رجب ۹ھ میں تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینے سے نکلے جن میں دس ہزار سوار تھے اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ اس پر گرمی کی شدت اور پانی کی کمی۔ مگر مومنوں نے اس موقع پر اپنے ایمان کے خلوص، نبی کی اطاعت اور اللہ کی راہ میں سرفروشی کے جس شوق کا ثبوت دیا تھا اللہ تعالیٰ نے اُسے قبول فرمایا اور ایسا انتظام فرما دیا کہ بغیر کسی لڑائی کے ہی وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے سے کوچ فرمایا تھا۔ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ قیصر نے سرحد سے اپنی فوجیں ہٹا لی ہیں اور اب کوئی مقابلے کے لئے موجود ہی نہیں ہے۔ ہوا یہ کہ جب قیصر کو یہ معلوم ہوا کہ اس کی اتنی زبردست تیاری کی اطلاع پانے کے باوجود مسلمان اس بے خوفی کے ساتھ مقابلے کے لئے خود مدینے سے نکل پڑے ہیں اور برابر بڑھتے چلے آ رہے ہیں تو اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی فوجیں

ہٹالے وہ اس سے پہلے دیکھ چکا تھا کہ غزوۂ موتہ کے موقع پر تیس ہزار مجاہدوں نے دو لاکھ فوج کے مقابلے میں کیسی شجاعت دکھائی تھی اس لئے جب اُسے معلوم ہوا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں تو اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اس سیلاب کا مقابلہ نہ کیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ پانسہ پلٹ جائے اور اس کی ساکھ ختم ہو جائے۔

تبوک پر قیام:۔

قیصر کے اس طرح میدان سے ہٹ جانے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافی سمجھا اور اس کا پیچھا کرنے کے بجائے اس علاقے پر اپنے اثرات کو مضبوط کرنا مناسب خیال فرمایا آپ وہاں بیس روز تک ٹھہرے اور اس درمیان بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو سلطنت روم اور اسلامی حکومت کے درمیان واقع تھیں اور اب تک رومیوں کے زیر اثر تھیں۔ اسلامی حکومت کا مطیع اور باج گذار بنا لیا اور اس طرح اب تک جو عرب قبیلے قیصر روم کا ساتھ دیتے تھے اب وہ اسلامی حکومت کے مددگار اور معاون بن گئے۔

منافقوں کی چال:۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی مہم پر مدینہ سے روانہ ہوئے اس وقت وہ سب لوگ جو دراصل مسلمان نہیں تھے لیکن اسلامی جماعت میں اپنے کسی نہ کسی مفاد کے لئے گھس آئے تھے۔ مدینہ میں ہی پیچھے رہ گئے تھے ان لوگوں کو پورا یقین تھا کہ مسلمان اس مہم سے بخیریت واپس نہ آسکیں گے کچھ تو موسم کی سختی اور سفر کی مصیبتوں کا شکار ہو جائیں گے اور نہیں تو قیصر کی بے پناہ فوج

کے مقابلے میں ان کا قلع قمع ہو جائے گا۔ ان منافقوں نے ایک مسجد بھی بنالی (مسجد ضرار) جہاں یہ نماز کے بہانے عام مسلمانوں سے الگ جمع ہوتے تھے اور خفیہ مشورے کیا کرتے تھے۔ اِن لوگوں نے اس موقعِ پر اسلامی تحریک کو انتہائی نقصان پہنچانے کے لئے قسم قسم کی سازشیں کیں اور یہاں تک طے کرلیا کہ تبوک کی جنگ کا فیصلہ معلوم ہونے کے بعد جس کے بارے میں اُنھیں یقین تھا کہ وہ مسلمانوں کی شکست ہی کی صورت میں نکلے گا، عبداللہ بن ابی کو مدینہ کا بادشاہ بنالیا جائے گا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا اور اب دراصل وہ وقت بالکل قریب آرہا تھا جب اسلام کی شکست کے بارے میں اہل کفر کی ہر اُمید پر مکمل پانی پھرنے والا تھا۔ چنانچہ تبوک کی اس بلا جنگ فتح کے حالات جب اسلام کے دشمنوں کو معلوم ہوئے تو ان کی کمر ٹوٹ گئی اور اُنھیں ایسا معلوم ہوا کہ اب ان کی امیدوں کا آخری سہارا بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

تبوك سے واپسی کے بعد:-

تبوک سے واپسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین اہم کام تھے۔

۱-منافقوں کے بارے میں واضح پالیسی پر عمل اوران کی ریشہ دوانیوں سے اسلامی تحریک کو محفوظ کرنے کا پورا پورا بندوبست۔

۲-مومنین صادقین کی تربیت اور ان کے سلسلے میں کردار سازی کے ان گوشوں کی تکمیل جن کے بغیر صالحین کا یہ گروہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں

تیار ہو رہا تھا۔ شہادت حق کے اس بار کو نہیں اُٹھا سکتا تھا جو عنقریب ان کے کاندھوں پر آنے والا تھا۔

۳-- دارالاسلام کی اس واضح سیاسی پالیسی کا اعلان جس پر اس نئی اسلامی مملکت کی تشکیل ہونا تھی۔

منافقوں کے ساتھ معاملہ:-

ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے مدینہ واپس تشریف نہیں لائے تھے کہ راستے میں ہی سورۂ توبہ نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی ایسی ہدایات سے سرفراز فرمایا جن پر آپ کو مدینہ واپس آنے کے بعد عمل کرنا تھا۔ اب تک منافقوں کے ساتھ جس نرم پالیسی پر عمل کیا گیا تھا اور جس کے ماتحت ان کے وہ عذرات قبول کر لیے گئے تھے جو اُنھوں نے لڑائی سے جان بچانے کے لئے تبوک کے سفر کے وقت آنخضرتؐ کی خدمت میں پیش کیے تھے اس کو بالکل بدل دینے کی ہدایت کی گئی اور صاف صاف کہہ دیا گیا کہ ان کے ساتھ معاملہ سختی کا کیا جائے۔ یہ اگر اپنے جھوٹے دعویٰ ایمان کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مالی امداد پیش کریں تو وہ قبول نہ کی جائے، ان میں سے کوئی مرجائے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جنازے کی نماز نہ پڑھائیں مسلمان ان سے شخصی اور خاندانی تعلقات کی بنا پر خلوص اور دوستی کا معاملہ نہ رکھیں۔

ابو عامر کی سازشیں:-

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے ایک عیسائی راہب ابو عامر کی درویشی اور علم کا مدینہ میں بڑا چرچا تھا۔ لوگ اس کو بہت مانتے

تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو اس کی درویشی اور خداپرستی کا نتیجہ تو یہ نکلنا چاہیے تھا کہ وہ ہدایت کی روشنی سے فائدہ اٹھاتا اور خداپرستی کے صحیح تصور کو سب سے پہلے بڑھ کر قبول کرتا۔ لیکن جس طرح علم اور تقویٰ کا غلط پندار اور رسمی اور رواجی دین داری کا مظاہرہ عام طور پر انسان کو ہدایت کی پیروی سے روک دیتا ہے اسی طرح ابو عامر پر بھی اسلامی دعوت کا الٹا ہی اثر پڑا۔ اس کی نظر اپنے دین داری کے کاروبار پر گئی اور اس نے محسوس کیا کہ اب اس نئی تحریک کے مقابلے میں اس کی درویشی اور پیری کا سکہ نہیں چل سکے گا اور اسی لیے وہ تحریک اسلامی کا سب سے سخت مخالف بن گیا۔

پہلے تو اسے یہ اُمید رہی کہ چار دن کی چاندنی ہے بھلا کہیں اس قسم کی خداپرستی اور دین داری کی قیود کو لوگ قبول کیا کرتے ہیں لیکن جب بدر کی لڑائی میں قریش نے شکست کھائی تو وہ تلملا اُٹھا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبیلوں کو اسلام کے خلاف بھڑکانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اُحد کی لڑائی اور احزاب کے حملے میں جو کچھ مسلمانوں کے سامنے آیا اس میں اس درویش کی کوششوں کو بہت کچھ دخل تھا۔ اس عیسائی اہل کتاب نے مسلمانوں کے خلاف مشرکوں سے ساز باز کرنے اور توحید کے چراغ کو بجھانے کیلئے شرک کی آندھیاں اٹھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن جب اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کھل کر سامنے آنے لگا کہ "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔" اور یہ کہ اسلام ہی تمام عرب کا غالب دین ہو کر رہے گا تو اس "خداپرست درویش" کی بے چینی کی کوئی انتہا نہ رہی اور اب اس نے روم کا سفر اختیار کیا تا کہ وہاں جا کر وہ خطرے کی گھنٹی بجائے اور قیصر کو متوجہ

کرے کہ وہ اس اٹھتے ہوئے طوفان کو روکنے کیلئے جو کچھ کر سکے کرے۔

مسجد ضرار:-

ابو عامر کی ان تمام کوششوں میں مدینہ کے منافقوں کا ایک گروہ اس کا شریک کار تھا اور باہم مشوروں سے یہ لوگ اسلامی تحریک کو مٹانے کی تدبیریں کیا کرتے تھے چنانچہ اسی شخص کی تجویز کے مطابق مدینے کے کچھ منافقوں نے اپنی ایک الگ مسجد بنانے کا فیصلہ کیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس جگہ یہ لوگ نماز کے بہانے سے جمع ہوتے اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیا کرتے۔

اس وقت مدینے میں دو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجد قبا جو شہر کے ایک کنارے تھی اور دوسری مسجد نبوی جو درمیان شہر واقع تھی۔ ان کی موجودگی میں کسی تیسری مسجد کی واقعی ضرورت نہ تھی لیکن ان منافقوں نے یہ بہانہ کر کے کہ کچھ بوڑھے اور معذور لوگوں کو ان دونوں مسجدوں تک جانے میں بہت تکلیف ہوتی ہے ایک تیسری مسجد بنائی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اس میں آپ ایک بار نماز پڑھا دیں تا کہ اس مسجد کا افتتاح خیر و برکت کے ساتھ ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تو میں تبوک کی مہم پر جانے کی تیاری میں مشغول ہوں واپسی پر دیکھا جائے گا۔ واپسی کے وقت راستے میں ہی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر آپ کو اس مسجد میں نماز پڑھنے سے ممانعت فرما دی۔ اور یہ بتا دیا کہ یہ دراصل ایک ایسی جگہ ہے جو مسلمانوں کے خلاف مشورے کرنے کے لئے بطور گھات کے کام میں لائی جاتی ہے یہ اس قابل نہیں کہ آپ اس میں نماز پڑھیں چنانچہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ وہ مدینہ جا کر اس مسجد کو آپ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ڈھادیں۔ اس طرح اس مسجد کا ڈھانا دراصل منافقوں کے خلاف مسلمانوں کے آئندہ طرز عمل کا ایک کھلا ہوا اعلان تھا اور اسی پر آئندہ عمل کیا گیا۔

اھل ایمان کی تربیت کی تکمیل:-

اب اسلامی تحریک ایک عالمگیر جدوجہد کی منزل میں داخل ہونے والی تھی اور وہ وقت قریب تھا جب عرب کے یہ مسلم تمام غیر مسلم دنیا کو اللہ کے دین کا پیام پہنچانے کی مہم پر نکلنے والے تھے۔ ایسے مرحلے میں مومنین کے اندر کوئی معمولی سی کمزوری بھی بڑی رکاوٹ کا سبب بن سکتی تھی اسی لئے اس مرحلے پر مومنین کی تربیت کی تکمیل پر پوری توجہ کی گئی۔ اوران کے اندر ایمان کی کمزوری کی ایک ایک علامت کو چن چن کر نکالا گیا اور اس کو دور کرنے کی تاکید کی گئی۔

تبوک کی جنگ کے موقع پر جہاں وہ لوگ پیچھے رہ گئے تھے جن کے اندر واقعی ایمان اور اسلام موجود نہیں تھا وہاں کچھ ایسے مومنین بھی پیچھے رہ گئے تھے جو اگر چہ سچے مسلمان تھے لیکن کسی وقتی کمزوری یا سستی کی بنا پر ان سے یہ کوتاہی سرزد ہوگئی تھی۔ ایسے لوگوں کی اصلاح کے لئے کافی سخت رویہ اختیار کیا گیا تاکہ آئندہ ایسی کمزوری ظاہر نہ ہو سکے۔ اس ذیل میں تین صحابہ کرام حضرات کعب بن مالک، ہلال بن امیہ، اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا واقعہ نہایت سبق آموز ہے جس کی روشنی میں یہ اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے کہ اس وقت مومنین کی تربیت کس انداز پر کی جارہی تھی۔ یہ تینوں صحابی اگر چہ سچے مومن تھے اور اس

سے پہلے ان کے اخلاصِ ایمان کا تجربہ بھی ہو چکا تھا لیکن چونکہ محض سستی کی وجہ سے وہ تبوک کی مہم کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ دے سکے تھے اس لئے ان کی سخت گرفت کی گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک سے واپس تشریف لانے کے بعد مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ کوئی ان سے سلام کلام نہ کرے اور چالیس دن کے بعد ان کی بیویوں کو بھی ان سے الگ رہنے کی تاکید کردی گئی۔ پچاس دن کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان کی معافی کا حکم نازل فرمایا جو سورۂ توبہ میں مذکور ہے ان میں ایک صاحب حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ خود ان کی زبانی منقول ہوا ہے جو نہایت ہی سبق آموز ہے وہ فرماتے ہیں کہ:۔

حضرت کعب کا واقعہ:۔

''جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو تبوک کی مہم کے لئے تیار کررہے تھے۔تو میں بھی یہ ارادہ کرلیتا تھا کہ اب چلنے کی تیاری کروں مگر پھر سستی کرجاتا اور کہتا تھا، ابھی کیا ہے۔جب وقت آئے گا تو تیار ہوتے کیا دیر لگتی ہے، اسی طرح بات ٹلتی رہی۔ یہاں تک کہ روانگی کا وقت آگیا اور میں تیار نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ لشکر کو چلنے دو، میں دو ایک روز بعد بھی چلوں گا تو قافلے سے جاملوں گا۔غرض یہ کہ اسی سستی میں وقت نکل گیا اور میں جا نہ سکا۔

جب میں یہ دیکھتا تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ میں پیچھے رہ گیا ہوں وہ یا تو منافق ہیں یا ایسے کمزور اور مجبور لوگ ہیں جن کو اللہ نے معذور رکھا ہے تو میرا دل بے انتہا کڑھتا تھا اور مجھے اپنی حالت پر بڑا افسوس ہوتا تھا۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے تو حسب معمول آپ نے پہلے مسجد میں آکر دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ پھر لوگوں سے ملاقات کے لئے بیٹھے۔ اب منافقوں نے آآکر اپنے عذرات پیش کرنا شروع کیے اور قسمیں کھا کھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مجبوری کا یقین دلانے لگے۔ ایسے لوگ اسّی آدمیوں سے کچھ زیادہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بناوٹی باتیں سنیں۔ اوران کے ظاہری عذر قبول فرما کران کے باطن کو خدا پر چھوڑ دیا۔ اور اُنھیں معاف کردیا۔ اب میری باری آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ آنحضرتؐ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا۔ ''کہیے آپ کو کس چیز نے روکا تھا۔'' میں نے عرض کیا خدا کی قسم اگر میں کسی اہلِ دنیا کے سامنے حاضر ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی بات بنا کر اُسے راضی کرلیتا مگر آپ کے بارے میں تو میرا ایمان ہے کہ اگر اس وقت کوئی بات بنا کر آپ کو راضی بھی کرلوں تو اللہ ضرور آپ کو مجھ سے ناراض کردے گا۔ البتہ اگر سچ سچ کہہ دوں تو چاہے آپ ناراض ہی کیوں نہ ہوں، مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے لئے کوئی نہ کوئی معافی کی صورت پیدا فرمادے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے، جو میں پیش کرسکوں۔ میں جانے پر پوری قدرت رکھتا تھا۔'' اس پر حضورؐ نے فرمایا۔ ''یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی، اچھا اٹھ جاؤ اور انتظار کرو۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ تمھارے معاملے میں کوئی فیصلہ فرمائے۔'' میں اُٹھا اور اپنے قبیلے کے لوگوں میں جا بیٹھا۔ میری طرح دو اور آدمیوں (مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ) نے بھی وہی سچی بات کہی جو میں نے کہی تھی۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ ہم تینوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کرے۔ وہ دونوں تو گھر میں بیٹھ گئے مگر میں نکلتا تھا۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا، بازاروں میں چلتا پھرتا تھا اور کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سرزمین بالکل بدل گئی ہے، میں یہاں اجنبی ہوں اور یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے، مسجد میں نماز کے لئے جاتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا اور انتظار ہی کرتا رہ جاتا کہ جواب کے لئے آپ کے ہونٹ ہلتے ہیں یا نہیں۔ نماز میں نظریں چرا کر حضورؐ کو دیکھتا تھا کہ آپؐ کی نگاہیں مجھ پر کیسی پڑتی ہیں۔ مگر وہاں حال یہ تھا کہ جب تک میں نماز پڑھتا آپ میری طرف دیکھتے رہتے اور جہاں میں نے سلام پھیرا آپؐ نے میری طرف سے نظریں ہٹالیں۔ ایک روز میں گھبرا کر اپنے چچازاد بھائی اور بچپن کے یار ابوقتادہ کے پاس گیا اور ان کے باغ کی دیوار پر چڑھ کر اُنھیں سلام کیا مگر اس اللہ کے بندے نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا۔ ''ابوقتادہ! میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا میں خدا اور اُس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا؟'' وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر پوچھا، پھر خاموش رہے۔ تیسری مرتبہ بس اتنا کہا۔ ''اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔'' اس پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میں دیوار سے اتر آیا۔

ان ہی دنوں ایک دفعہ بازار سے گزر رہا تھا کہ شام کے ایک شخص نے شاہ غسان کا ایک خط حریر میں لپٹا ہوا مجھے دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ ''ہم نے سنا ہے۔ تمھارے صاحب نے تم پر ستم توڑ رکھا ہے تم کوئی ذلیل

آدمی نہیں ہو۔ نہ اس لائق ہو کہ تمھیں ضائع کیا جائے۔ ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمھاری قدر کریں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ اور بلا آئی" اور اسی وقت خط کو چولھے میں جھونک دیا۔

چالیس دن اس حالت میں گذر چکے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آیا کہ اپنی بیوی سے بھی علیحدہ ہو جاؤ۔ میں نے پوچھا۔ "کیا طلاق دے دوں؟ جواب ملا۔ "نہیں بس الگ رہو۔

میں نے اپنی بیوی کو ان کے میکے بھیج دیا اور کہا۔ "انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے کا فیصلہ فرما دے۔"

پچاسویں دن صبح کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا تھا اور اپنی جان سے بیزار ہو رہا تھا کہ یکا یک کسی شخص نے پکار کر کہا۔ "مبارک ہو کعب بن مالک"! میں یہ سنتے ہی سجدے میں گر گیا۔ اور میں نے جان لیا کہ میری معافی کا حکم ہو گیا پھر تو فوج در فوج لوگ بھاگے چلے آرہے تھے اور ہر ایک دوسرے سے پہلے پہنچ کر مجھ کو مبارک باد دے رہا تھا کہ تیری توبہ قبول ہو گئی۔ میں اٹھا اور سیدھا مسجد نبویؐ کی طرف چلا۔ دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہے۔ میں نے سلام کیا تو فرمایا تجھے مبارک ہو، یہ دن تیری زندگی میں سب سے بہتر ہے" میں نے پوچھا۔ "یہ معافی حضور کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے؟" فرمایا۔ "خدا کی طرف سے" اور قرآن کی وہ آیات سنائیں جن میں اِس توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے۔

میں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہؐ! میری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ میں اپنا

سارا مال خدا کی راہ میں صدقہ کر دوں۔'' فرمایا۔'' کچھ رہنے دو یہ تمھارے لئے بہتر ہے۔'' میں نے اس ارشاد کے مطابق اپنا خیبر کا حصہ رکھ لیا۔ باقی سب صدقہ کر دیا۔ پھر میں نے خدا سے عہد کیا کہ جس سچ کے بدلے میں اللہ نے مجھے معافی دی، اس پر تمام عمر قائم رہوں گا، چنانچہ آج تک میں نے کوئی بات جان بوجھ کر خلاف واقعہ نہیں کہی۔ اور اُمید رکھتا ہوں کہ آئندہ بھی اللہ مجھے اس سے بچائے گا۔''

مسلم معاشرے کی خصوصیات:-

اس واقعہ کی تفصیلات میں صحابہ کرام کی سوسائٹی کا جو نقشہ سامنے آتا ہے اس کی کچھ نمایاں خصوصیات ایسی ہیں جو ہر مومن کے سامنے رہنا چاہئیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تحریک اپنے علم برداروں کا مزاج کیسا بناتی ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ جب کفر اور اسلام کی کشمکش کا معاملہ درپیش ہو تو یہ مومنوں کے لئے انتہائی سخت امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں کسی غفلت کی وجہ سے ساری عمر کا کیا کرایا غارت نہ ہو جائے۔ کیونکہ ایسے وقت میں اگر کوئی مومن اسلام کا ساتھ نہ دے تو چاہے اس کی یہ کوتاہی کسی بد نیتی کی بنا پر نہ ہو اور چاہے ساری عمر میں ایک ہی بار ایسی کوتاہی سرزد ہوتا ہم اس بات کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کا یہ طرز عمل اس کی ساری عمر کی نیکیوں اور عبادتوں کو برباد نہ کر دے۔ مومن کے لئے کسی موقع پر اس امر کی گنجائش نہیں نکلتی کہ وہ اسلام کے بدلے کفر کا ساتھ دے اور کوئی ایسا عمل کرے جس سے کسی غیر اسلامی تحریک کو تقویت پہنچتی ہو۔ یہ

صورتحال اس موقع پر اور زیادہ نازک ہو جاتی ہے جب غیر اسلامی تحریکوں کے مقابلے میں کوئی اسلامی تحریک موجود ہو اور مومنوں کی صلاحیتیں اللہ کے دین کو بلند کرنے کے بدلے کسی دوسرے میں لگ رہی ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی فرض کے ادا کرنے کا وقت آجائے تو اس وقت مومن کے لئے سستی دکھانا ٹھیک نہیں۔ کبھی سستی ہی سستی میں وقت نکل جاتا ہے اور پھر یہ عذر کچھ کام نہیں دیتا کہ اس کا قصور بدنیتی کی بنیاد پر نہیں تھا۔

صحابہ کرامؓ کی سوسائٹی کا حال یہ ہے کہ ایک طرف منافقین ہیں جو بناوٹی عذر پیش کر رہے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ظاہری باتوں کو سن کر اُن کا قصور معاف کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان سے یہ اُمید ہی کب تھی کہ وہ کسی امتحان کے وقت ایمان کے خلوص کا ثبوت دیں گے۔ لیکن دوسری طرف کچھ سچے مومن ہیں جو اپنے ایمان اور اخلاص کا ثبوت اس سے پہلے کئی بار دے چکے ہیں وہ جھوٹی باتیں بنانا پسند نہیں کرتے۔ صاف صاف اپنی غلطی کو مان لیتے ہیں۔ لیکن اُن کے ساتھ اتنا سخت معاملہ کیا جاتا ہے کہ پوری سوسائٹی سے اُن کا بائیکاٹ کرا دیا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُن کے ایمان اور اخلاص کے بارے میں کوئی شبہ پیدا ہو گیا تھا بلکہ صرف اس لئے کہ اُنھوں نے وہ کام کیوں کیا جو منافقوں کے کرنے کا تھا۔ پھر لطف یہ کہ اس معاملے میں لیڈر جس شان سے سزا دیتا ہے اور پیرو جس شان سے اس سزا کو بھگتتے ہیں اور پوری جماعت جس شان سے لیڈر کی منشا کے مطابق عمل کرتی ہے اس کا ہر پہلو بے نظیر ہے لیڈر انتہائی سخت سزا دے رہا ہے۔ لیکن نہ غصہ ہے اور نہ

نفرت بلکہ گہری محبت کے ساتھ سزا دی جارہی ہے بالکل اسی طرح جیسے کوئی مہربان باپ قصوروار بیٹے کو سزا دے اور اس بات کا متمنی رہے کہ کب بیٹا درست ہوجائے تو پھر اُسے سینے سے چمٹالے۔ پیرو سزا کی سختی سے انتہائی بے چین ہے۔مگر کیا مجال کہ کسی موقع پر بھی اپنے محبوب لیڈر کی اطاعت کے بدلے کسی سرکشی کا وہم دل میں آجائے۔ نہ کوئی شکایت ہے۔نہ اپنے پہلے کارناموں کی داد کی طلب، پھر اس جماعت کو دیکھئے کہ اس کے اندر اپنے لیڈر کے احکام کی اطاعت کا جذبہ کس شدت سے موجود ہے۔ادھر حکم ملا کہ فلاں شخص سے تعلقات ختم کردیے جائیں تو معلوم ہوا کہ پوری بستی میں شاید اس شخص کا کوئی شناسا ہی نہ تھا۔اور ادھر معافی کا اعلان ہوا تو پھر ہر شخص بے چین ہوگیا کہ وہی سب سے پہلے جاکر مبارک باد پیش کرے۔

اطاعتِ رسول کا یہ ایک نمونہ ہے جو قرآن اپنے پیروؤں میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اور جو دین کی خاطر کام کرنے والوں میں اپنے سربراہ کار اور اولی الامر کے لئے موجود رہنا لازمی ہے۔ قصوروار کو دیکھئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس سے زیادہ بڑے قصوروار محض جھوٹ بول کر صاف بچ گئے، اور اس کو اس کے سچ بولنے پر اتنا سخت پکڑا جارہا ہے۔ لیکن اس بات پر اس کے اندر نہ غصہ پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی ناگواری کا اظہار ہوتا ہے۔سزا ملنے کے بعد اس نے پورے پچاس دن تک انتہائی سختی کے ساتھ سزا جھیلی۔لیکن کسی ایک گھڑی کے لئے بھی اس کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہوا کہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی گئی ہے، اس کے پچھلے کارناموں پر پانی پھیر دیا گیا ہے اس کے ایمان اور اخلاص پر شبہ کیا گیا ہے،

حالانکہ وہ نہ بدنیت ہے اور نہ اللہ کے رسول کی محبت سے اس کا دل خالی ہے۔ اُس نے جماعت میں کوئی سازش نہیں کی، لوگوں میں بددلی نہیں پھیلائی، دوسروں کو اپنا ہم خیال بنا کر جماعت کے اندر ایک اور جتھا تیار کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ انتہائی صبر وسکون کے ساتھ سزا کو برداشت کیا اور ہر آن اس اُمید میں رہا کہ کب اس کی کوتاہی کو معاف کیا جاتا ہے۔ یہی وہ مثالی طرز عمل ہے جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے انتہائی پیار بھرے الفاظ میں ان بزرگوں کی توبہ کی قبولیت کا اعلان فرمایا اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یہ وہ فضل ہے جو اسی کو ملتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ عطا فرمائے۔

دعویٰ ایمان کی حقیقت:-

ایمان اور اسلام کا دعویٰ ایک شخص پر کتنی ذمہ داریاں عائد کر دیتا ہے اس کی وضاحت کے لئے اس موقع پر صاف صاف جتا دیا گیا کہ دراصل اس دعویٰ کی حیثیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جان اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لئے ہیں (سورۂ توبہ آیت ۱۱۱) ایمان کی یہ وضاحت جب تک اچھی طرح ذہنوں میں بیٹھی ہوئی نہ ہو اور ہر موقع پر انسان کے سامنے نہ رہے وہ دین کے تقاضے پورا کرنے میں لازماً سستی برتے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ایک معاہدے سے تعبیر کیا ہے جو مومن اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ وہ معاہدہ یہ ہے کہ بندہ اپنا نفس اور اپنا مال گویا خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے، اور اس کے بدلے میں خدا کے اس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد اس ہمیشہ رہنے والی زندگی میں اسے اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائے گا۔

جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے اس اعتبار سے تو انسان کا جان اور مال سب کچھ اللہ ہی کا ہے، اسی نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے اور وہی اُن کا حقیقی مالک ہے، ایسی صورت میں بندے کا اپنا ہے ہی کیا جو وہ اللہ کے ہاتھ بیچے۔ اس طرح تو بیچنے اور مول لینے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لیکن ایک چیز ایسی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر بندے کو عطا کر دی ہے اور اُسے پورا اختیار دیا ہے کہ وہ اُسے جیسے چاہے کام میں لائے، وہ ہے اس کے ارادے اور اختیار کی آزادی۔ اُسے اس امر کی آزادی دی گئی ہے کہ اللہ کی دی ہوئی جان اور اس کے بخشے ہوئے مال کو وہ چاہے تو اللہ کی ہی ملکیت تسلیم کرتا رہے جیسا کہ وہ حقیقت میں ہے اور چاہے تو وہ خود اپنے آپ ان چیزوں کا مالک بن بیٹھے حالانکہ وہ ان چیزوں کا مالک نہیں، اللہ تعالیٰ نے اُسے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو خدا سے منہ موڑ کر اپنی جان اور اپنے مال کو اپنی خواہش یا اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی خواہش کے مطابق جس راہ پر چاہے لگا دے اور اگر چاہے تو اصل مالک کو مالک نہیں کر کے اس کی بخشی ہوئی جان اور اس کے دیئے ہوئے مال کو اسی مالک کی مرضی کے مطابق کام میں لائے اور اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ دراصل اُس کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی امانت ہے اور وہ ان چیزوں کے استعمال میں خود مختار اور مالک کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

ارادے اور اختیار کی یہی تھوڑی سی آزادی دراصل اس معاملے کی بنیاد ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے خرید وفروخت فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ بندے سے مطالبہ کرتا ہے کہ میری بخشی ہوئی امانت میں اگر تو باوجود اختیار کے خیانت کا

رویہ اختیار نہ کرے گا۔ بلکہ اس امانت کو اسی طرح کام میں لائے گا جس طرح میری مرضی ہو تو میں تجھے اس زندگی کے بعد آنے والی دائمی زندگی میں اپنی اس نعمت سے نوازوں گا جس کا نام جنت ہے۔ اب جو شخص اللہ تعالیٰ کے اس مطالبے کو قبول کر کے یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی جان اور مال کو صرف اللہ کی مرضی کے کاموں میں لگائے گا اور اس کے بدلے وہ آخرت کی زندگی میں اللہ کی جنت لینے پر راضی ہے وہ دراصل مومن ہے اور اس کا یہ معاملہ جسے اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت فرمایا ہے اُس کے ایمان کا اقرار ہے اور جو شخص اس مطالبے کو قبول نہیں کرتا بلکہ اپنی جان اور مال کو اللہ کی مرضی کے خلاف کام میں لانے کا فیصلہ کرتا ہے وہ گویا اللہ کے ساتھ اس خرید و فروخت کے معاملے کو نہیں کرتا وہی کافر ہے اور اس کا یہی انکار کفر ہے۔

جنگ تبوک کی تیاری کے لئے جن لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا وہ سب وہ لوگ تھے۔ جنھوں نے اپنے مومن ہونے کا اقرار کیا تھا۔ گویا یہ سب وہ لوگ تھے، جنھوں نے اللہ کے ساتھ اس خرید و فروخت کے معاملے کو طے کیا تھا جس کا ذکر اوپر ہوا لیکن جب اس دعویٰ کے امتحان کا نازک موقع آیا تو ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی نکلے جو اس امتحان میں پورے نہ اُترے اور اُنھوں نے اپنی جان اور مال کو اللہ کی راہ میں لگانے سے روک لیا۔ اُن میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو منافق تھے۔ جن کے ایمان کا دعویٰ جھوٹا تھا اور جو محض مصلحت یا دباؤ کی وجہ سے اسلامی جماعت میں گھس آئے تھے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن سے یہ غلطی محض سستی اور غفلت کی وجہ سے سرزد ہوگئی تھی۔ لہٰذا اس

موقع پر ان سب لوگوں پر کھل کر تنقید کرنے کے بعد اُنھیں صاف صاف بتا دیا
کہ ایمان محض یہ مان لینے کا نام نہیں ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہے بلکہ ایمان
دراصل مالک ہے اور اس طرح اُسے مالک مان لینے کے بعد اگر کوئی اپنی جان
اور مال کو اللہ کی راہ میں لگا دینے سے جی چراتا ہے اور اُسے اس راہ کے سوا کسی
دوسری راہ میں لگاتا ہے تو دراصل وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے اقرار میں جھوٹا
ہے ایمان کے تمام مدعیوں کو اپنے دعویٰ کی یہ اصل حقیقت ہمیشہ اپنے سامنے
رکھنا چاہیے اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے سے کسی موقع پر جی نہ چرانا چاہیے۔

عوام کی دینی تربیت:-

ابتدائے اسلام کے وقت جو لوگ اس تحریک کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ
ہوتے تھے وہ وہی لوگ ہوتے تھے جن کے دلوں میں اسلام کی سچائی گھر کر لیتی
تھی اور جو بات کو پوری طرح سمجھ کر اسلام قبول کرتے تھے لیکن اب جب کہ
اسلام کا اثر چاروں طرف پھیلنے لگا تو آبادیوں کی آبادیاں فوج درفوج اسلام
میں داخل ہونے لگیں ظاہر ہے کہ ان میں تھوڑے ہی لوگ ایسے ہوتے تھے جو
اسلام کو پوری طرح سمجھ کر ایمان لاتے تھے۔ زیادہ تر لوگ وہ ہوتے تھے جو بغیر
کچھ زیادہ سوچے سمجھے اسلام کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ بظاہر تو
یہ صورتِ حال اسلام کی قوت کا سبب تھی کیونکہ ہزاروں آدمی اس میں شامل
ہوتے جارہے تھے لیکن جب تک کوئی گروہ اسلام کے تقاضوں کو اچھی طرح نہ
سمجھتا ہو اور ان تمام اخلاقی بندشوں کو پورا کرنے کے لئے تیار نہ ہو جو اسلام اپنے
ماننے والوں پر عائد کرتا ہے تو درحقیقت ایسا گروہ اسلامی نظام کی کمزوری کا

باعث ہوتا ہے۔ یہی صورتِ حال اس وقت پیدا ہورہی تھی جس کا کچھ نہ کچھ اندازہ غزوہ تبوک کے موقع پر ہو بھی گیا تھا لہٰذا اس موقع پر تحریک اسلامی کو اس اندرونی کمزوری سے بچانے کے لئے ایک نہایت اہم ہدایت یہ دی گئی کہ آبادی میں سے کچھ لوگ اسلام کے مرکزوں پر آئیں مثلاً مدینہ اور مکہ وغیرہ۔ اور یہاں آکر اسلامی تعلیمات اور اس کی تفصیلات کو سیکھیں اور صحیح اسلامی روح کو اپنے اندر جذب کریں پھر واپس جاکر اپنی اپنی بستیوں میں عوام کی تعلیم اور تربیت کا انتظام کریں تاکہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں صحیح اسلامی شعور پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقفیت ہو۔

اس عمومی اسلامی تعلیم سے مراد دراصل لوگوں کو محض لکھنا پڑھنا سکھانا نہیں تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ وہ اسلامی اور غیر اسلامی زندگیوں کے طریقوں میں تمیز کر سکیں۔ چاہے یہ کام لکھنا پڑھنا سکھانے کے بعد کیا جائے یا بغیر اس کے کیا جائے۔ اصل مقصد دین کا صحیح شعور پیدا کرنا ہونا چاہیے۔ پڑھنا لکھنا اس کے لئے ذریعہ بن سکتا ہے۔ مقصد نہیں بن سکتا۔[1]

دارالاسلام کی پالیسی کا واضح اعلان:-

تبوک کی مہم کی کامیابی کے بعد ان سب لوگوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا جو ابھی تک یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ کسی نہ کسی وقت اسلامی تحریک کو کوئی ایسا دھکا

---

[1] وہ لکھنا پڑھنا جس کا مقصد اسلامی شعور پیدا کرنا نہ ہو بلکہ جس کا نتیجہ اسلامی شعور سے محرومی ہو، وہ علم نہیں بلکہ جہالت ہے۔

پہنچا ئیں گے کہ اس کا خاتمہ ہی ہو جائیگا۔ اب ایسے تمام لوگوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہ گیا کہ وہ اسلام کے دامن میں پناہ لیں۔ اور اگر خود اس نعمت سے فائدہ نہ اٹھائیں تو کم سے کم ان کی آئندہ نسلیں بالکل اسلام کے رنگ میں رنگ جائیں۔

اس وقت تقریباً تمام عرب کی حکومت اہل ایمان کے ہاتھ میں تھی اور ان کے مقابلے کے لئے کوئی قابل لحاظ طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ اس لئے اب وہ وقت آگیا تھا کہ اسلامی حکومت کی داخلی پالیسی کا واضح اعلان کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ حسب ذیل حکومت میں پیش کر دی گئی۔

(الف) عرب سے شرک کو قطعاً مٹا دیا جائے اور پرانا مشرکانہ نظام بالکل ختم کر کے عرب کو ہمیشہ کے لئے خالص اسلامی مرکز بنا دیا جائے۔ اس غرض کے لئے مشرکین سے قطعی بے تعلقی اختیار کی جائے اور ان کے ساتھ جتنے معاہدے ہیں ان کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا جائے۔

چنانچہ ۹ھ میں حج کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حاجیوں کے عام مجمع میں اعلان کرا دیا کہ:۔

(۱) جنت میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہوگا جو دین اسلام قبول کرنے سے انکار کر دے۔

(۲) اس سال کے بعد کوئی مشرک خانہ کعبہ کے حج کے لئے نہ آوے۔

(۳) بیت اللہ کے گرد ننگے ہو کر طواف کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دی جائے گی۔

(۴) جن لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کا معاہدہ باقی ہے اور جنھوں نے اپنے معاہدے کی مدت تک خلاف ورزی نہیں کی ہے ان کے ساتھ اس معاہدے کی مدت تک وہی معاملات رکھے جائیں گے جن کے بارے میں معاہدہ ہوا ہے۔
لیکن جن لوگوں نے معاہدے کے باوجود اسلامی تحریک کے خلاف سازشیں کی ہیں ان کو مطلع کیا جاتا ہے۔

☆ بس اب ان کے لئے صرف چار مہینے کی مہلت باقی ہے اس مہلت کے اندر چاہے تو وہ مسلمانوں سے لڑکر اپنی قسمت کا فیصلہ کرلیں یا ملک چھوڑ کر چلے جائیں یا پھر سوچ سمجھ کر اللہ کے دین کو قبول کریں اور اسلامی نظام میں شامل ہو جائیں۔

☆ کعبے کا انتظام اور اس کی تولیت مکمل طور پر اہل توحید کے ہاتھ میں رہے گی۔ مشرکوں کو اس میں کوئی دخل نہ ہوگا اور اب کعبے میں کوئی مشرکانہ رسم ادا نہ ہونے پائے گی بلکہ اب مشرک اس پاک گھر کے قریب بھی نہ آنے پائیں گے۔

++

بارھواں باب

آخری حج اور وفات

حج کے لئے روانگی:-

ہجرت کے دسویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ فرمایا۔ ذیقعدہ ۱۰ھ میں اعلان کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لئے تشریف لے جارہے ہیں۔ یہ خبر تمام عرب میں پھیل گئی اور اس مبارک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج ادا کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے شوق میں تمام عرب اُمنڈ آیا۔ ذی قعدہ کی آخری تاریخوں میں آپ مدینے سے روانہ ہوئے اور ذی الحجہ کی ۴ تاریخ کو صبح کے وقت مکے تشریف لے آئے۔ آنے کے بعد پہلے کعبے کا طواف کیا اور پھر مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا فرمائی پھر صفا کی پہاڑی پر تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے اُتر کر مروہ پر تشریف لائے۔ اور اس دوران برابر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا فرماتے اور دعائیں کرتے رہے، طواف اور صفا ومروہ کی سعی سے فارغ ہوکر آپ نے جمعرات کے روز آٹھویں تاریخ کو تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا۔ دوسرے دن ۹/ذی الحجہ کو صبح کی نماز پڑھ کر آپ منیٰ سے روانہ ہوئے اور عرفات تشریف لائے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تاریخی خطبہ حج پڑھا جس میں اسلام اپنے پورے جاہ وجلال

کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس خطبے میں آپؐ نے بہت سے اہم اُمور کے بارے میں ہدایات دیں۔ ان میں سے کچھ حسب ذیل ہیں۔ فرمایا:۔

حج کا خطبہ:۔

''سن رکھو، جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں''

''عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔''

''مسلمان، مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

تمھارے غلام! تمھارے غلام!! جو خود کھاؤ وہی اُن کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی اُن کو پہناؤ۔''

''جاہلیت کے تمام خون باطل کر دیئے گئے۔ (اب کسی کو کسی پر پرانے خون کا بدلہ لینے کا حق نہیں) اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون، ربیعہ بن الحرث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں۔''

جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے (اب کسی کو کسی سے سود کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں) اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود، عباس بن عبدالمطلب کا سود، باطل کرتا ہوں۔''

''عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔''

تمھارا خون اور تمھارا مال قیامت تک کے لئے ایک دوسرے پر حرام [1] ہے اسی طرح جس طرح یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر حرام ہے۔

---

[1] قابل احترام:

''میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ رہو گے اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔''

اس کے بعد آپ نے بہت سے اُصولی احکامِ شریعت بیان فرمائے۔ پھر مجمع کی طرف خطاب کر کے پوچھا:-

''تم سے خدا کے یہاں جب میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا کہو گے؟''

صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم کہیں گے کہ ''آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا۔ ''اے اللہ! تو گواہ رہنا'' اِسی موقع پر قرآن پاک کی یہ آیات نازل ہوئی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعمَتِی وَرَضِیْتُ لَکُمُ الاِسْلاَمَ دِیْناً o ط

ترجمہ :- آج میں نے تمھارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لئے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کیا۔

اس حج کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے تمام طریقے خود کر کے دکھائے، کہ حج کس طرح کرنا چاہیے۔ اسی موقع پر آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ''مجھ سے حج کے مسائل سیکھ لو۔ میں نہیں جانتا شاید اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے۔''

اسی موقع پر آپؐ نے تمام مسلمانوں سے یہ بھی فرمایا:-

فَلْیُبَلِّغ الشَّاھِدُ الغائِبَ

ترجمہ :- جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ (یہ سب باتیں) ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔

بیماری:-

صفر ۱۱ھ کی ۱۸/ یا ۱۹/ تاریخ تھی کہ مزاج مبارک کچھ ناساز ہوا۔ یہ بدھ کا دن تھا۔ پیر کے دن مرض میں شدت ہوگئی جب تک قوت رہی آپ مسجد میں تشریف لاکر نماز پڑھاتے رہے۔ سب سے آخری نماز جو آپ نے پڑھائی وہ مغرب کی نماز تھی۔ سر میں درد تھا۔ رومال باندھ کر تشریف لائے اور نماز میں سورۂ المرسلات عرفاً پڑھی۔ عشاء کے وقت کمزوری بڑھ گئی اور آپ مسجد تشریف نہ لا سکے اور فرمایا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں۔ چنانچہ کئی دن تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، نے نماز پڑھائی۔

آخری خطبہ اور ہدایات:-

درمیان میں ایک دن طبیعت کچھ سنبھلی تو آپ نے غسل فرمایا۔ مسجد تشریف لائے اور ایک خطبہ دیا۔ یہ آپ کی زندگی کا سب سے آخری خطبہ تھا۔ آپ نے فرمایا:۔

''خدا نے اپنے ایک بندے کو اختیار عطا فرمایا کہ چاہے تو وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت میں) جو کچھ ہے اس کو قبول کر لے۔ لیکن اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر سمجھ گئے کہ اس میں اشارہ کس طرف ہے، اور آپ رو پڑے آنحضرتؐ نے مزید فرمایا:۔

''سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور رفاقت کا ممنون ہوں وہ ابوبکر ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی اُمت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لئے کافی ہے۔

اور ہاں سن لوتم سے پہلے قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا دیکھوتم ایسا نہ کرنا۔ میں تم کو منع کیے جاتا ہوں۔'' پھر فرمایا:-

''حلال اور حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے۔ میں نے وہی چیزیں حلال کی ہیں جو خدا نے حلال کی ہیں اور وہی چیزیں حرام کی ہیں جو خدا نے حرام کی ہیں۔

اسی مرض کی حالت میں ایک دن آپ نے اہلِ خاندان کو مخاطب کر کے فرمایا:-

''اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہ اور اے پیغمبر خدا کی پھوپھی صفیہ! کچھ کرلو۔ جو خدا کے یہاں تمھارے کام آئے میں تمھیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔''

ایک دن مرض کی تکلیف زیادہ تھی آپ کبھی چادر منہ پر ڈال لیتے اور کبھی اُلٹ دیتے۔'' اس حالت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے زبان مبارک سے یہ الفاظ سنے:-

یہود اور نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو۔ اُنھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔''

آپ نے حضرت عائشہ کے پاس کبھی کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں۔ اسی بے چینی کی حالت میں ایک بار فرمایا۔ ''عائشہ وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ کیا محمدؐ خدا سے بدگمان ہوکر ملے گا؟ جاؤ اُن کو خدا کی راہ میں خیرات کردو۔''

رفیق اعلیٰ کی طرف کوچ:-

مرض میں کبھی زیادتی ہوجاتی اور کبھی کمی۔ جس دن وفات ہوئی۔ یعنی دوشنبہ کے

دن۔اس دن بظاہر طبیعت کو سکون تھا۔لیکن جیسے جیسے دن چڑھتا گیا آپ پر بار بار غشی طاری ہوتی گئی۔اس حالت میں اکثر زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے رہے۔

مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ

ترجمہ:-ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا۔

اور کبھی فرماتے:-

اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی

ترجمہ:-خداوند بڑے رفیق ہیں!

اور کبھی فرماتے:-

بَلِ الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی

اب اور کوئی نہیں بلکہ وہ بڑا رفیق درکار ہے۔

یہی کہتے کہتے حالت غیر ہونے لگی اور روحِ پاک عالمِ قدس میں پہنچ گئی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ بَارِکْ وَسَلِّمْ

سال وفات سن ۱۱ھ ہے۔ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ دوشنبہ کا دن عام طور پر مشہور ہے کہ تاریخ ۱۲/تھی۔ لیکن اس میں اختلاف ہے۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی تحقیق کے مطابق یہ ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ تھی۔

دوسرے دن تجہیز و تکفین کی تکمیل ہوئی اور شام تک جسد مبارک اسی حجرے میں جہاں آپ نے انتقال فرمایا تھا۔ سپردخاک کر دیا گیا۔

اِنَّکَ مَیِّت وَّاِنھُمْ مَیِّتُوْنَ

اِنَّاللّٰہِ وَاِنَّا اَلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

++